جماعت اسلامی کی فردِ قراردادِ جُرم

(از جناب مولانا الحاج حکیم عبدالرشید محمود صاحب گنگوہی)

[ذیل میں ایک بزرگ کا مضمون درج کیا جا رہا ہے جو دراصل رسالہ "فاران" کراچی کو بغرضِ اشاعت بھیجا گیا تھا، مگر مدیر فاران نے وہ ازراہِ عنایت ہمارے پاس بھیج دیا تاکہ ہم جواب سمیت اسے شائع کردیں۔ ہم ایک مدت سے سن رہے تھے کہ دیوبند و سہارنپور کے مدارسِ علمیہ سے انتساب رکھنے والے متعدد بزرگوں کی مجالس میں جماعت اسلامی کے خلاف اعتراضات و الزامات اور وسوسہ اندازیوں کا سلسلہ چل رہا ہے اور ان کے معتقدین بالعموم مسلمانوں کو اس جماعت سے بدگمان کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، لیکن ابھی تک ہمیں تفصیل کے ساتھ معلوم نہ ہوسکا تھا کہ آخر ہمارا وہ قصور کیا ہے جس کی یہ سزا دی جارہی ہے۔ اب ہم مدیر فاران کے شکر گزار ہیں کہ ان کے وسیلے سے یہ فردِ قراردادِ جرم ہمیں مل گئی اور پہلی مرتبہ ہمیں اس بات سے آگاہی نصیب ہوئی کہ ان مقدس بارگاہوں میں ہمیں کن قصوروں کا مجرم ٹھیرایا جاتا ہے۔

ابتداءً یہ تحریر صرف ایک "مستند عالمِ دین اور متدین و متشرع بزرگ" کے نام سے آئی تھی۔ بعد میں جب معلوم ہوا کہ یہ ہمارے پاس بغرضِ جواب پہنچ گئی ہے تو اظہارِ نام کی اجازت دے دی گئی۔

اس تحریر میں جو جزوی غلط بیانیاں یا غلط فہمیاں ہیں ان کا جواب حاشیہ میں ہی دیدیا گیا ہے اور آخر میں ایک جامع اصولی جواب مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کے قلم سے درج کیا جا رہا ہے۔

اس موقع پر ہم تحدیثاً للنعمۃ جماعت اسلامی کی اس خدمت پر اظہارِ فخر کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ایک مدت دراز کے بعد اس امت کو ہماری بدولت ایک نقطۂ اجتماع میسر آیا ہے۔ اس وقت کمیونسٹ، قادیانی، منکرینِ حدیث، خلاعت پسند ملاحدہ، فرنگیت زدہ اصحاب و خواتین، اور بریلوی خیال کے حضرات توقی طبقہ جماعت اسلامی کے خلاف متحد ہوچکے ہیں۔ اور ان کے ساتھ اہلِ حدیث

اور دیوبندی بزرگوں کا بھی ایک بڑا حصہ اس محاذ پر متفق ہو کر ایک ملتِ واحدہ بنا رہا ہے۔ جماعت اسلامی کی دعوت نہ اٹھتی تو شاید اتنے مختلف احزاب کسی معاملے میں یوں مجتمع نہ ہو سکتے۔

ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء]

مولانا مودودی اور ان کی جماعت کے متعلق میرے تاثرات آپ دریافت فرما رہے ہیں۔ دیانۃً جو میری رائے ہے وہ عرض کرتا ہوں۔ گو مجھ کو اندیشہ ہے کہ پوری بات احتیاط کے ساتھ مع اپنے تمام کمزوری گوشوں کے اُسی قدر وزن کے ساتھ جتنی کہ ہے شاید ادا نہ کر سکوں۔ ممکن ہے کہیں افراط ہو جائے اور کہیں تفریط۔ اس لئے اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے ہوئے اور ممکن احتیاط برت کر جو کچھ سمجھا عرض کرتا ہوں :-

غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مودودی کی دعوت، تحریک اور مجموعۂ لٹریچر کچھ منفعتیں بھی اپنے اندر رکھتا ہے اور بعض مضرتیں بھی۔ منفعت اس اعتبار سے کہ ایک ایسا طبقہ دین سے آشنا ہو رہا ہے جس کا دین کی طرف میلان دشوار تھا۔ اور وہ الحاد کی دلدل میں مبتلا تھا۔ کم از کم اور مضرتوں کے ساتھ اُن کے متکلمانہ انداز تعبیر اور حُسنِ ادب و انشا کی یہ خوبی ہے کہ وہ اس طبقے کے ریب و تشکیک یا جحود و انکار کو تصدیق و اثبات کی طرف مائل کرنے میں ایک حد تک کامیاب ہیں۔ نیز دین کے خلاف اور مذہب سے متصادم آج جو تحریکیں قومیت، وطنیت اور کمیونزم وغیرہ کی راہ سے سامنے آرہی ہیں اُن کے مقابلے کے لئے پوری طرح مستعد ہے۔ اس خدمت کا وزن اپنی جگہ پر بہت وزنی ہے۔ جو مضرتیں سامنے آرہی ہیں وہ یہ ہیں۔ جماعت کے حلقے میں غیر شعوری طور پر یہ زعم پیدا ہوتا جارہا ہے کہ دین، دین کا درد، اُس کا شعور، بس اس جماعت یا مودودی صاحب کے دائرے میں مخصوص ہے۔ بلکہ حضرات صحابہؓ کے بعد سے دین کو بہمہ معنویات اور بجمیع جزئیات، فقط بس ہم نے سمجھا ہے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی

سعیٔ مشکور صرف ہمارا حصہ ہے[۵۱] جتنی کڑیاں اس سلسلۃ الذہب کی بعض کڑیاں جو حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ سے شروع ہو کر ہندوستان میں خاندانِ ولی اللّٰہی اور حضرت سید احمد شہیدؒ تک پہنچیں وہ بھی باوجود اپنے تمام محاسن کے اغلاط سے خالی نہ تھیں۔[۵۲] اس پندار و زعم کا نتیجہ یہ ہے کہ جماعت ایک فرقے کی

۵۱؎ اس مبہم الزام کا اگر کوئی ثبوت موجود ہو تو ضرور ارشاد فرمایا جائے۔ اور اگر یہ نتیجہ صرف اُن تحریروں سے اخذ کیا گیا ہے جو اقامتِ دین کی سعی سے مسلمانوں کی عام غفلت، اور دین کے معاملے میں قوم کے مختلف طبقوں کی کوتاہیوں پر متنبہ کرنے کے لیے لکھی گئی ہیں، تو اس کو بدگمانی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ اور اس بدگمانی سے امت کے اگلوں پچھلوں میں سے کون ایسا شخص بچ سکتا ہے جس نے کبھی اصلاح کی کوشش کی ہے یا اب کرنے اٹھے؟ اگر ارشاد ہو تو زمانۂ گزشتہ کے بہت سے بزرگوں کی ایسی تحریروں کے نمونے پیش کیے جائیں جن میں اس "زعم" کا رنگ اُس سے بدرجہا زیادہ پایا جاتا ہے جس کی آپ شکایت فرما رہے ہیں۔ بعید نہیں کہ وہ نمونے خود آپ کی نظر سے بھی گزرے ہوں اور آپ کو وہ اس لیے نہ کھٹکے ہوں کہ وہ حضرات آپ کے معاصر نہیں ہیں اور آپ ان سے کوئی "خطرہ" محسوس نہیں فرماتے۔ مگر کیا آپ اُن لوگوں کو حق بجانب سمجھتے ہیں جو ان کے معاصر تھے اور جنھوں نے یہی رنگ دیکھ کر ان کے مقابلے میں وہ رویہ اختیار کیا جو آج آپ اور آپ جیسے بہت سے دیندار بزرگ اپنے ایک خادمِ دین معاصر کے مقابلے میں اختیار فرما رہے ہیں؟ قریب ترین دور کی مثال حضرت سید احمد بریلوی اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی ہے جس پر ابھی ایک صدی سے کچھ ہی زیادہ مدت گزری ہے۔ ان کے ساتھ ان کے معاصرین کا جو معاملہ رہا ہے اسے ذرا یاد فرمائیں۔

۵۲؎ ممکن ہے آپ کے نزدیک تمام بزرگانِ سلف معصوم اور منزہ عن الخطا ہوں اور شاید ان کو ایسا سمجھنے کے لیے آپ کے پاس کچھ شرعی دلائل بھی موجود ہوں مگر ہم انبیاء کے سوا کسی کا یہ مرتبہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور خود بزرگانِ سلف نے اپنے بزرگانِ سلف کا یہ مرتبہ ماننے سے انکار کیا ہے۔ صحابہ کرامؓ کی مختلف آراء کے متعلق امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا احد القولین خطاء والماثم فیہ موضوع، اور امام مالکؒ نے صاف کہا خطاء و صواب فانظر فی ذالک۔ ہم نے جب کبھی سلف صالحین میں سے کسی کی رائے سے اختلاف کیا ہے، یا ان کے کام میں کسی خامی کی نشان دہی کی ہے تو پوری طرح ادب و احترام کو ملحوظ رکھ کر، اور ان کے زرین کارناموں کو خراجِ تحسین ادا کر کے کی ہے، اور اس غرض کے لیے کی ہے کہ ہم اپنی حد وسع تک صواب کو پہنچنے اور غلطی سے بچنے کی کوشش کریں۔ اسے اگر آپ بے ادبی یا تعلی پر محمول فرماتے ہیں تو ہم صرف یہ عرض کرنے پر اکتفا کریں گے کہ ذرا اپنے محدثوں کی ان تعزیروں کو بھی یاد فرمائیں جو درسِ حدیث و فقہ کے سلسلے میں ہوا کرتی ہیں اور جن میں امام بخاریؒ اور امام شافعیؒ جیسے ائمہ کا اس شان سے تخطیہ کیا جاتا ہے کہ شاید ہماری کسی تقریر و تحریر میں اس کے عشرِ عشیر کی نظیر بھی نہ پیش کی جا سکے۔

صورت اختیار کر رہی ہے۔ تحزب اور گروہ بندی کی خصوصیت تفریق ہے۔ اور جماعت کے اندر اور باہر کا امتیاز رہتا ہے۔ چنانچہ اس جماعت کے افراد کی زبان پر التزاماً آتا ہے کہ ہم اصلی اور تحقیقی مسلمان ہیں، دوسرے نسلی اور تقلیدی۔ لٹریچر سے جو طبقہ بھی متاثر ہوتا ہے۔ وہ بقدر تاثر عام علمائے امت سے بدظن ہوتا جا رہا ہے۔ اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتا جا رہا ہے کہ دین کی روح پر ہم مطلع ہیں جس کے نتیجے میں وہ اپنے آپ کو اجتہاد کا مستحق سمجھنے لگتا ہے۔ چونکہ دنیا کے کسی عالم متقدم یا متاخر پر تو اس کو اعتماد رہتا نہیں۔ اس لئے دین کے بارے میں کسی عالم کی طرف رجوع کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ خود اجتہاد کرتا ہے یا جماعت کے وابستہ اہل علم سے رجوع کرتا ہے اور

سنئے بھی یہاں، علمائے امت سے بدظنی تو اب اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ جماعت اسلامی مسلمانوں کی پوری قومی زندگی کی باگ ڈور علمائے دین کے ہاتھ میں دینے پر تل گئی ہے، اور پنجاب کے تازہ انتخابات میں اسی خطاکار جماعت نے (شاید اس ملک کی سیاسی تاریخ میں پہلی مرتبہ) یہ کوشش کی کہ ایک درجن سے زیادہ علماء کا ایک پورا جتھا اسمبلی میں بھیجا جائے، اور پاکستان میں سیاسی اقتدار پر علماء کے قابض ہونے کا خطرہ اگر ہے تو اسی قابل ملامت گروہ کی کوششوں سے ہے، ورنہ اگر یہ گروہ میدان میں نہ ہو، یا نہ رہے تو اس خطرے کے رونما ہونے کا نہ امکان تھا نہ آئندہ اس کا اندیشہ ہے۔ یہ سب علماء سے بدظنی ہونے کے تو کھلے کھلے ثبوت ہیں!

ہمارے متدین اور متشرع ناقد اگر برا نہ مانیں تو ہم عرض کریں کہ جس طریقے سے علماء کے مختلف طبقوں اور بعض نمایاں بزرگوں نے جماعت اسلامی کی مخالفت فرمائی ہے اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ مسلمانوں کی دوسری جماعتوں کی طرح اس جماعت میں بھی علماء سے بدظنی بلکہ نفرت پیدا ہو جاتی، لیکن اس جماعت کی ذہنی ساخت ہی کچھ ایسی ہے کہ کسی ظالم کا ظلم اسے حق اور انصاف کی راہ سے نہیں ہٹا سکتا۔ بعض علماء کی زیادتیوں کے باوجود تمام علماء کے خلاف کوئی جذبہ کسی ادنیٰ درجے میں بھی جماعت کے لوگوں میں پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ خود زیادتی کرنے والوں کے خلاف بھی نفرت کے بجائے اگر کوئی جذبہ پیدا ہوا تو وہ افسوس کا تھا۔ پھر یہ جماعت کبھی علم دین کی اہمیت سے غافل نہیں ہوئی اور اس نے ہمیشہ یہی سمجھا کہ مسلمانوں کے معاملات کی صحیح طریقے سے سربراہ کاری اگر کچھ لوگ کرسکتے ہیں تو وہی جو دین کا علم رکھتے ہوں۔

جماعت کے پورے حلقے میں ایک عالم بھی ایسا نہیں جس کا علم اور تفقہ تفصیلی مسائل میں لائق اعتماد ہو۔ اس لیے ان کے بڑے بڑے مدعیانِ علم مسائل کے بارے میں فاحش اور مضحکہ خیز غلطیاں کرتے ہیں۔[۵] صرف یہی نہیں کہ فقہ حنفی کے اعتبار سے وہ غلطی کرتے ہوں۔ بلکہ چونکہ کتاب وسنت اور فقہائے امت کے استنباطات پر ان کی نظر بہت کم ہے۔ انھوں نے دین کے صرف ایک ہی شعبہ کا اچھا مطالعہ کیا ہے۔ باقی شعبوں میں ان کا علم بہت ناقص اور خام ہے اس لیے فاحش غلطیاں پیش آتی ہیں۔ مگر جماعت دین میں انھی کو مرجع سمجھتی اور اعتماد کرتی ہے۔ میرے خیال بلکہ مشاہدہ میں جماعت کی اکثریت میں یہ مرض پیدا ہو رہا ہے۔ جو اشراط ساعت میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق اعجاب کل ذی رائ برایہ ہے۔ اس اعجاب رائے کا یہ اثر ہے کہ ہر فرد جماعت قائل با جتہاد اور براہ راست کتاب وسنہ سے اخذ واستنباط کا مدعی ہے۔ خواہ

---

۵ بڑی مہربانی ہوگی اگر دو چار "فاحش" اور "مضحکہ خیز" غلطیوں کی نشان دہی فرمادی جائے۔ اس کے بعد کچھ عرض کیا جاسکے گا۔ البتہ اصولی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا آدمی ہو جس نے وسیع پیمانے پر کوئی علمی کام کیا ہو اور اس میں کچھ نہ کچھ غلطیاں نہ کی ہوں۔ مگر یہ آپ لوگوں کی وسعتِ ظرف ہے کہ اپنے گروہ کے کسی شخص سے غلطی ہو جائے تو پہلے تاویلیں کر کر کے اس کی بات بنانے کی کوشش کرتے ہیں، اور پھر بھی جب بات نہیں بنتی تو اس کو قلم کی لغزش اور سہو ونسیان وغیرہ نرم الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں لیکن اپنے گروہ سے باہر کے کسی شخص کی کوئی غلطی نظر آجائے تو وہ فاحش اور مضحک غلطی سے کم الفاظ کی مستحق نہیں ہوتی، اور معاملہ اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس بنیاد پر فیصلہ یہ صادر کیا جاتا ہے کہ وہ شخص علم سے محروم ہے اور اسے مسائل دین میں کلام کرنے کا حق نہیں ہے۔ ہم اس بحث کو ناگوار حد تک بڑھانا نہیں چاہتے، ورنہ اس تعصب اور اجارہ دارانہ ذہنیت کی متعدد مثالیں پیش کرسکتے۔ تاہم فاضل ناقد سے اور ان کے طرز پر سوچنے والے دوسرے حضرات سے اتنی گزارش ضرور کریں گے کہ جماعت اسلامی کے جن لوگوں کا ذکر آپ نے "بڑے بڑے مدعیانِ علم" کے الفاظ سے کیا ہے، براہ کرم ذرا ان کے علمی کام پر ایک نگاہ ڈالیں اور کچھ انصاف کے ساتھ (اگر انصاف کی جنس گرانمایہ آپ کے پاس ہو) بتائیں کہ آپ کے نزدیک ان کے اس پورے ذخیرے میں صحیح کام کتنے ہیں اور "فاحش" و "مضحک" غلطیاں کس قدر۔

اس کا علم اور مبلغِ فکر جماعتی لٹریچر کی چند کتب ہی ہوں۔ اور بے باکی کے ساتھ فقہائے امت اور سلفِ صالحین پر تنقید کے لئے پر تولنے کو تیار[۹۱]۔ مگر نہیں جانتا۔ کہ تنقید و اجتہاد کی حدود کیا ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ حدِ تنقید سے نکل کر تنقیص و تحمیق کی سرحد میں داخل ہو جاتا ہے[۹۲]۔ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیشین گوئی کا مورد بنتا ہے کہ اخیر زمانے میں لوگ ناجائز چیزوں کا نام بدل کر جائز کر لیں گے۔ تنقیص و تخفیف کے ذمیمے کو تنقید کے عنوان سے بدل کر راہ جواز اختیار کرنا عموماً مشاہد ہے۔ یہ تنقیص تحتِ وعید۔ لعن آخر ھذہ الامۃ اولھا (اس امت کے آخر زمانے کے لوگ سلف کی تنقیص کریں گے) کی خبر دے رہی ہے۔

ایک اہم ترین ضررِ دین کے ایک بڑے شعبہ سلوک و تصوف اور احسان سے متعلق بھی ہے۔ اکابرِ جماعت چونکہ اس کوچے سے عملاً اور اعتقاداً بالکل فارغ ہیں۔ اس لئے اب اس جماعت کا مزاج یہ بنتا جا رہا ہے کہ اس شعبے کی خیر سے نہ صرف وہ محروم ہیں۔ بلکہ اس خیر کے حاملین صوفیائے کرام اور اربابِ سلوک (جو تنہا اس کفرزار آذرستان میں اشاعتِ اسلام کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آلہ جارحہ رہے اور جن کے انفاسِ پاک سے آج کروڑوں مسلمان یہاں نظر آ رہے ہیں)

---

[۹۱] یہ صریح تہمت ہے جو تقوی کا لباس اوڑھ کر لگائی گئی ہے۔ کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ جناب کو کتنے افرادِ جماعت سے ملنے اور ان کے کام اور کلام سے واقف ہونے کا موقع ملا ہے جس کی بنا پر یہ شہادت ادا کی جا رہی ہے کہ جماعت کا ہر فرد کتاب و سنت سے براہِ راست اخذ و استنباط کا مدعی اور فقہائے امت اور سلف صالحین پر تنقید کے لئے پر تولنے کو تیار ہے؟ دوسروں پر جب آپ لوگ زبان کھولتے ہیں تو یوں حق اور انصاف سے بے نیاز ہو کر صریح بہتان گھڑنے تک سے نہیں چوکتے۔ اور دوسرے اگر کبھی پورا پورا ادب و احترام ملحوظ رکھ کر بھی آپ کے گروہ کے کسی چھوٹے یا بڑے سے اختلافِ رائے کا اظہار کر گزریں تو اس کا ایسا گہرا زخم آپ حضرات کے دلوں پر لگتا ہے کہ دس دس بارہ بارہ برس گزر جانے پر بھی جب ٹٹولیے تو معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک ہرا ہے۔

[۹۲] براہِ خدا ایک مثال ایسی پیش فرمائیں جس میں فقہائے امت اور سلف صالحین کی "تنقیص" اور "تحمیق" کی گئی ہو۔ اور اگر آپ پیش نہیں کر سکتے تو پھر ارشاد ہو کہ یہ حدود تنقید سے جناب کی واقفیت ہی کا جلوہ ہے جو ان سطور میں نظر آ رہا ہے؟

شعوری یا غیر شعوری طور پر مبغوض ہوتے جا رہے ہیں اور جن قدسی نفوس کو ہم قرآن و سنہ کا مکھن کھلنے اور کھلانے والا تصور کرتے تھے آج وہ یوگی، اشراقی، اور سنیاسی کے القاب سے ملقب کئے جا رہے ہیں۔ اور ان کو قطعاً یہ اندازہ نہیں کہ ہم کتنی بڑی خیر سے محروم اور کسی عظیم جسارت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ صرا احتادہ لوگ سلوک و احسان کے منکر نہیں۔ مگر حصولِ احسان و تحصیل سلوک کے طُرق متعارفۂ صوفیا کا وہ اس شدت سے رد کرتے ہیں کہ وہ صرف طرق ہی سے اختلاف کی حد تک نہیں رہتا۔ بلکہ اُن طرق کو اختیار کرنے والوں کی تنقیص اور بدگمانی تک منجر ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے بعض ذی علم محتاط افراد اس تعدی سے محفوظ ہوں جن کی تعداد بہ غایت محدود ہوگی۔ ورنہ عامۃً اکثریت اس سے خالی نہیں[۵۱]۔ ظاہر ہے کہ جب مولانا مودودی حضرت مجدد سرہندیؒ اور شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کے تمام کمالاتِ تبحر، تدین، تفقہ اور تورع اور جامعیت کاملہ کے ساتھ ان کی مجددیت کو تسلیم کرتے ہوئے یہ لکھیں کہ "مگر مسلمانوں کو طرقِ تصوف کی مہلک اور زہریلی غذا ان حضرات نے دی"[۵۲] تو مولانا نے تو ان حضرات کی معرفتِ شان ملحوظ رکھتے ہوئے اسی جملہ پر اکتفا کیا۔ مقلدین ضروری نہیں کہ تجزیہ کر کے محتاط ہی رہیں۔ وہ کہہ سکتے اور سمجھ سکتے ہیں۔ کہ اگر یہ حضرات مجدّد تھے تو مجدد کا پہلا کام ماحول کی تشخیص ہے۔

۵۱۔ ہم پھر دریافت کرتے ہیں کہ جماعت کی اکثریت سے آپ کی واقفیت ہے کتنی جس کی بنا پر آپ دیانۃً کوئی عام حکم چسپاں کرنے میں حق بجانب ہوں؟

۵۲۔ یہ ادھورا اور ایک حد تک خود ساختہ فقرہ جس عبارت سے اخذ کیا گیا ہے وہ رسالہ تجدید و احیائے دین میں صفحہ ۳۷ سے ۵۰ تک ملاحظہ کر لی جائے۔ اس پوری عبارت کو پڑھ کر ہی ایک انصاف پسند ناظر رائے قائم کر سکتا ہے کہ وہاں کیا بات کس رنگ میں کہی گئی ہے اور یہاں اس فرد قرار داد جرم میں اسے کیا رنگ دے کر پیش کیا جا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کسی [illegible] دین نے سنت سے اختلاف ہی ہوا [illegible] نہیں اگر وہ اختلاف باقی رہے مگر کیا کوئی منصف مزاج اور حق پرست آدمی اس کو [illegible] عبارت پڑھ کر یہ [illegible] جس طرح [illegible] نے اس جملے کو جس طرح یہاں لکھا ہے۔ اور اس کی لپیٹ میں پوری جماعت [illegible] معقول [illegible] ہے؟

اور یہ متعین کرنا کہ جاہلیت کس منفذ اور راستے سے قصرِ اسلام میں داخل ہوئی ہے۔ اس تشخیص اور تعیّن کے بعد مجدّد کا کام یہ ہے کہ اُس منفذ کو فوراً بند اور اُس راہ کو فوراً مسدود کر دے جس سے جاہلیت نے راہ پائی ہے۔ اور مولانا مودودی کے خیال میں جاہلیت خصوصیت سے براہِ تصوف اس قصر میں داخل ہوئی ہے۔ تو مجدّد سرہندی اور شاہ ولی اللہ ایسے مجدّدین جنھوں نے اس راہ کو نہ مشخص کیا نہ مسدود کیا۔ صرف صوفیائے جُہّال کی چند مخترعہ رسوم میں اصلاح پر اکتفا کیا حالانکہ ضرورت تھی قطعی انسداد کی۔ تو ظاہر ہے کہ یہ حضرات اور ان کے اختیار کردہ تمام وسائلِ تحصیلِ سلوک۔ جماعت کی نظر میں کس قدر موجبِ تخفیف ہو گئے۔ میں سوچا کرتا ہوں کہ سلاسل اربعہ کے تمام مروجہ طرق جن کی اصل کتاب و سنۃ میں بالدلالت موجود ہے۔ اور سلف سے خلف تک متقدمین سے متاخرین تک کسی نے ان کو ترک نہیں کیا حتّٰی کہ اُن میں وہ حضرات بھی ہیں جن کو امت نے من یجدد لھا دینھا کا مصداق اور خدمت تجدید و احیا کے شرف سے مشرف بھی سمجھا۔ اُن کو اپنایا اور انھی وسائل سے سلوک و احسان کی بلندیوں تک پہنچے حتّٰی کہ امام غزالیؒ تو المنقذ من الضلال ص ۳۱ میں یہاں تک لکھتے ہیں کہ وبالجملۃ فمن لم یرزق منہ شیئاً بالذوق فلیس یدرک من حقیقۃ النبوۃ الا الاسم یعنی مختصر یہ کہ جس نے تصوف کا مزہ نہیں چکھا۔ وہ نام کے سوا نبوت کی حقیقت کو جان نہیں سکتا۔ ممکن ہے اس پر یہ کہا جائے کہ تصوف کا انکار نہیں۔ بلکہ طُرقِ تصوف پر گفتگو ہے۔ تو آگے طرق کے متعلق فرماتے ہیں۔ وبان لی بالضرورۃ من ممارسۃ طریقتھم حقیقۃ النبوۃ وخاصیتھا یعنی صوفیوں کے طریقے کی مشق سے مجھ کو نبوت کی حقیقت اور خاصیت بدیہی طور پر معلوم ہو گئی۔ یقیناً ان طرق میں کوئی عمیق منفعت اور عظیم مصلحت موجود ہے۔ اور تجربہ اور فکرِ غائر سے بھی یہ بات معلوم ہوئی کہ اگرچہ یہ طرق وسائلِ احسان کے موقوف علیہ نہیں نہ ان پر انحصار ہے کہ الطرق الی اللہ بعدد انفاس الخلائق تو مسلّم ہے۔ مگر اس دورِ بعید عن خیر القرون میں عامۃ افراد و آحاد انھی طرق کے ذریعہ اقصٰی منازلِ روحانیت۔ قرب و معیتِ حق۔ ربط باللہ، خشیۃ اللہ اور استغنائے حق کی خصوصی و معیاری کیفیاتِ راسخہ تک پہنچے ہیں۔ اور مجددینِ امت

تک نے اِن طُرق کو اختیار و استعمال کیا ہے۔ اور سوائے علامہ ابن تیمیہؒ کے کسی نے ان سے اعتراض نہیں کیا۔ ہو سکتا تھا کہ اسلم ولو کنت کارھاً ہی تک رہتے جس پر نجات کا مدار ہے اور جس کی تفسیر حضرت مجدد سرہندیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نفس کے انکار کے باوجود صرف قلب و جنان کی تصدیق پر کفایت فرما کر نجات دیدیں گے۔ البتہ نفس کا تکسر نہ ہوگا۔ کیف و حال اور ذوق و وجدان کا انشراح عادۃً آج انھی طرق میں مشاہد ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ بطریقِ مرادیت اپنے انجذابِ خصوصی سے کسی کو نوازیں۔ اس لئے رد و انکار کے بجائے اگر کسی شخص کو ان طرق سے مناسبت نہ ہو تو نہ اختیار کرے کہ مامور بہ تو یہ نہیں۔ ایسے شخص کے لئے صرف عباداتِ مقصودہ ماموزہ ہی پر جن کی ہیئات بھی منصوب و منصوص ہیں قناعت کافی ہے اُس کو نسبت احسان انھی عباداتِ مقصودہ میں حاصل ہو سکتی ہے۔ بلکہ استعمالِ طرق کے بعد جب احسان تک سالک پہنچ جاتا ہے۔ تو مشائخ ترکِ طرق کا حکم دے کر صرف منصوصہ عبادات میں مشغولی کا مشورہ دیتے ہیں۔ غرض مقصد یہ ہے کہ ان طرق کا رد و انکار اور بغض و کراہت تو ایک تعدّی ہے جو ان آحاد و اساطین امت کے ردّ و انکار اور بغض و تخفیف تک مفضی ہوتی ہے۔ غایت ما فی الباب نہ اختیار کرے۔ اختیار پر اصرار نہیں اس لئے کہ ان پر مدارِ نجات نہ یہ احسان کے موقوف علیہ محض وسائل کے درجے میں ہیں۔ جن کو باحتیاط استعمال کیا جا سکتا ہے۔ نقشبندیہ اور خصوصاً حضرت مجدد سرہندیؒ نے تصورِ شیخ تک کو استعمال کرایا جو بجد خطرناک اور مخدوش طریقہ ہے محض اس لئے کہ جانتے تھے لوگ عموماً خوگرِ پیکرِ محسوس ہیں۔ صورتِ محسوس کے بغیر مجردِ معنیٰ تک وصول کی صلاحیت ہی نہیں محسوس پرستی کا ذوق اس قدر مسلّط ہے اور تجرید و تفرید معانی سے اس قدر عاری ہیں کہ بغیر اس کے خدا کا تصور و تمکن قلوب میں ہوتا ہی نہیں۔ سالہا سال کی اصنام پرستی۔ صورت پسندی اور اِجْعَلْ لَنَا اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ اور لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً۔ کی بدذوقی نے تنزیہی الوہیت بے شبہ و مثال ہے کیف و لون۔ بے جہت و قیاس خدا کا تصور دشوار تر کر دیا۔ اور وصول تو مرد کی لہٰذا ہوائی سفر کے بجائے چھکڑے ہی کے ذریعے اگر قطع مسافت ممکن ہو تو یوں ہی سہی۔ مقصد تو وصول

ہے۔ مگر چونکہ مخدوش ہے اس لئے بعض حضرات نے اس سے گریز بھی کیا۔ حاصل یہ ہے کہ یہ طرق اس جماعت کے نزدیک اس درجہ منکر و مبغوض ہو گئے کہ اب یہ بغض و منکریت ذوات صالحین تک پہنچ گئی۔ میرے کان نے ایک رکن جماعت کی زبان سے بلا واسطہ۔ ایک بڑے زبردست صاحب سلسلہ چشتی بزرگ (جن کے وصال پر تین سو سال گزرے) کے متعلق ان لوگوں کو مخاطب کر کے کہتے سنا جو ان کے مزار پر حاضر ہو رہے تھے "کہاں جا رہے ہو۔ ایک سنیاسی ہے جو پتھروں میں پڑا ہے"۔ ایک[1] اور صاحب کو جو ایک بڑے دار العلوم کے فاضل بھی ہیں اور جماعت کے رکن بھی حضرت مجدد سرہندیؒ کے مکتوبات پر رکیک تبصرہ کرتے دیکھا۔[2] قریب ہی ایک جماعتی ماہنامہ "زندگی" میں ایک شخص کا جو کم از کم ہمدرد تو یقیناً ہے۔ آدمی خاصہ پڑھا لکھا معلوم ہوتا ہے۔ جس میں وہ لکھتا ہے کہ لٹریچر دیکھنے سے مجھ میں یہ انقلاب رونما ہوا۔ کہ اب میں صحابہؓ کے بعد سے آج تک سوائے مولانا مودودی کے کسی شخص کو کامل الایمان نہیں سمجھتا۔ دین کے اس ضروری تقاضے سے جو مولانا مودودی نے سمجھا ہے تعجب ہے کہ صحابہؓ کے بعد سے اب تک ہر شخص فارغ اور خالی الذہن رہا خصوصاً صوفیا نے تو دین کو ایک پرائیویٹ اصول بنا کر جوگ و سنیاس کی حیثیت دیدی۔ میں خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے مسلک کو غلط تصور کرتا ہوں۔ بڑے بڑے مشاہیر امت کا کامل الایمان ہونا میری نظر میں مشتبہ ہو گیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آگے چل کر لکھا ہے کہ بعض دفعہ مجھ کو خیال ہوتا ہے کہ میں ہی غلطی پر ہوں۔ ایسا بھی کیا اس تیرہ سو سال میں ایک مودودی صاحب نئے نرالے مولوی۔ مجتہد۔ فہم دین رکھنے والے پیدا ہوئے جنھوں نے سلف کی تمام خدمات پر پانی پھیر دیا۔ وغیرہ۔ وغیرہ۔ پھر کہا ہے۔ باوجود اس کے اصول تحریک کتاب و سنت پر منطبق ہیں اس سے میں دست کش نہیں

---

[1] یہ گفتگو کہاں کس شخص سے ہوئی ہے؟ ذرا اس کی صراحت فرمائی جائے تاکہ تحقیق کی جاسکے۔

[2] ان صاحب کا نام بھی ارشاد ہو اور یہ بھی فرمایا جائے کہ وہ رکیک تبصرہ کیا تھا۔ اس کے بعد ان کا بیان بھی لیا جاسکے گا۔

نہیں ہوں گے۔ الخ[۱]

غور فرمائیے کہ یہ سب کچھ کیوں ہے۔ اس لئے کہ مولانا مودودی کا فکری و علمی مزاج و قوام باوجود اپنے اخلاص و نیک نیتی کے اسی انداز کا واقع ہوا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ "میں نے دین کو حال یا ماضی کے اشخاص سے سمجھنے کے بجائے براہِ راست کتاب و سنت سے سمجھا ہے۔" یہ عبارت کئی جگہ اُن کی تصانیف میں موجود ہے۔ اس عبارت نے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام ائمہ، فقہا، محدثین اور ان کی تمام علمی، فقہی مساعی اور خدمات سے امت کو یکسر مستغنی کر دیا ہے۔[۲] ممکن ہے مولانا کا مقصد اس کے مفہوم میں اس قدر عموم و توسع نہ ہو۔ مگر لٹریچر دیکھنے والے نہ صرف غیر اہل علم بلکہ اہلِ علم بھی اس عموم کے رجحان سے فارغ نہیں جس کا نتیجہ ہے سلف کی خدمات کی بے وقعتی یا کم از کم استغنا۔ اور خود کتاب و سنت سے اخذ و استنباط کا عزم۔ اور اپنے فہم نصوص و تعین مدلول کی ترجیح یعنی رجال و ہم رجال کا اعتماد۔ قبل اس جائزہ کے کہ آخذ کا ذخیرۂ علم کس قدر ہے۔ اور استنباط و اجتہاد کی حدود و شرائط کیا ہیں۔ حالانکہ جمہور اہلِ حق کا وہ مسلک اور احتیاطی

---

[۱] یہ عبارت جس کا یہاں اقتباس دیا جا رہا ہے ماہنامہ "زندگی" کے کس پرچے میں شائع ہوئی ہے؟ اگر ماہ و سال کی کچھ تصریح کر دی جاتی تو اصل مضمون نکال کر دیکھا جا سکتا تھا کہ لکھنے والے نے کیا لکھا ہے، ادارہ زندگی نے اسے کس حیثیت سے شائع کیا ہے، اور جناب اسے کیا رنگ دے رہے ہیں۔

[۲] یہ پھر ایک صریح تہمت ہے جو اس قدر بے باکی کے ساتھ لگائی گئی ہے جس عبارت کو آپ سیاق و سباق سے الگ کر کے اپنے من مانے معنی پہنا رہے ہیں اس سے قائل کا اپنا منشا یہ ہے کہ وہ دین کے فہم میں ماضی و حال کے کسی شخص یا گروہ کا اندھا مقلد نہیں ہے بلکہ کتاب و سنت کی کسوٹی اپنے پاس رکھتا ہے، اس لئے بڑے بڑے نام لے کر اس کو مرعوب کرنے کی کوشش نہ کی جائے بلکہ جو کچھ منوانا ہو اسے کتاب و سنت کی دلیل سے منوایا جائے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ شخص بزرگان سلف کی تمام علمی و فقہی مساعی سے خود مستغنی بنتا ہے اور دوسروں میں یہ استغنا پیدا کرتا ہے۔ یہ الزام اس پر کیسے لگایا جا سکتا ہے جب کہ اس نے سینکڑوں مواقع پر اپنے مضامین اور کتابوں میں، مفسرین، محدثین اور ائمہ مجتہدین سے استفادہ کیا ہے، ان کے اقوال سے استناد کیا ہے، اور لوگوں کو ان کی کتابوں سے استفادے کا مشورہ دیا ہے۔

مذاق ہے۔ مجدد اول حضرت عمر ابن عبد العزیز رحمہ ایک موقعہ پر فرماتے ہیں کہ:-

خذوا من الرأی ما يوافق من كان	اپنے سے پہلوں کی رائے کو ترجیح دو اور اختیار کرو
قبلكم فانهم كانوا اوفق بالسنة	اس لئے کہ وہ تم سے زیادہ اعلم اور موافق سنۃ تھے۔
واعلم منكم۔	یعنی زیادہ رازدانِ مزاجِ دین تھے۔

مولانا مودودی اجتہاد پر زور دیتے ہوئے حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کی بعض عبارتیں نقل فرماتے ہیں جن میں حضرت شاہ صاحب روحِ اجتہاد کے مردہ ہونے کی شکایت اور تقلید جامد سے اختلاف کرتے ہیں۔ بلاشبہ شاہ صاحبؒ اس طرف مائل تھے اور فرماتے تھے۔ وجبلتی تابی التقليد وتانف منه رأسا لكن طلب منی التعبد به بخلاف نفسی۔

مگر تعجب یہ ہے کہ مولانا اُن عبارتوں کو تو نقل فرما دیتے ہیں جو ترکِ تقلید اور اجتہاد کی ترغیب میں وارد ہیں۔ لیکن وہ تصانیف جو دو سالہ قیام حرمین شریفین کے بعد کی اور پختہ حال و عمر کی ہیں، مثلاً فیوض الحرمین۔ حجۃ اللہ۔ تفہیمات۔ عقد الجید۔ اُن میں جس شدت کے ساتھ ترک و منعِ اجتہاد اور مذاہب اربعہ میں محدود رہنے کی تاکیدات ہیں۔ اُن سے بالکل صرفِ نظر فرما جاتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ فیوض الحرمین ص ۶۴، ۶۵ میں فرماتے ہیں:-

استفدت منه صلى الله عليه وسلم	میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تین امور کا استفادہ کیا
ثلاثة امور خلاف ما كان عندی	اپنے رجحان کے خلاف ان میں سے دوسری یہ تھی
وثانيها الوصاة بالتقليد بهذه المذاهب	کہ ان مذاہب اربعہ (حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی)
الاربعة لا اخرج منها۔	سے ہرگز باہر نہ نکلوں۔

تفہیمات ص ۱۸ میں فرماتے ہیں کہ باوجود شرائط اجتہاد پائے جانے کے اگر کوئی قضیہ ایسا سامنے آئے کہ علمائے سابقین کا کوئی حکم و فتویٰ اس کے متعلق موجود ہو تو ہرگز اس سے تجاوز نہ کرے۔ عقد الجید ص ۳۸ میں فرماتے ہیں کہ آج مذاہبِ اربعہ سے نکلنا سوادِ اعظم سے نکلنے کے مترادف ہے۔ غرض جا بجا اقوال منعِ اجتہاد کی عبارات موجود ہیں۔ مگر مولانا نے ان سے قطعی اعتنا نہیں برتا حالانکہ

حالانکہ مقتضائے دیانت یہ تھا کہ دونوں قسم کے اقوال و عبارات نقل فرماتے۔ پھر اپنے رجحان و ترجیح کو پیش کرتے۔ پھر اس جہت میں عموم و اطلاق اس درجہ برتا کہ یہ پتہ نہیں چلتا کہ مولانا کس نوع اجتہاد کو لانا چاہتے ہیں۔ اجتہادِ مطلق۔ اجتہادِ انتساب۔ اجتہاد فی المذاہب اصحابِ ترجیح میں ہیں کہ اصحابِ تخریج میں۔ البتہ امیر جماعت ہند مولوی ابو اللیث صاحب تو صاف لکھتے ہیں کہ "ہم اجتہادِ مطلق کے قائل ہیں۔ ان اقسام کو نہیں جانتے"

اسی طرح فنِ حدیث میں "مسلکِ اعتدال" اُن کا ایک مقالہ ہے جو بعض جہات سے نہایت فاضلانہ ہے اور غیر معتدل بھی ہے۔ محدثینِ کرام کی تحقیقِ حدیث اور تعدیل و تنقیدِ رُواۃ و روایات کے ذیل میں انھوں نے حدیث کے اعتماد کو بہت حد تک کم اور سلف کے وقار کو بہت حد تک گرا دیا ہے۔ اس لئے کہ "بلحاظِ اسناد اور بلحاظِ تفقہ اُن میں جو سُقم ہے اُس کی بنا پر کونسی ایسی چیز ہے۔ جس میں غلطی کا احتمال نہ ہو" معیارِ استناد میں بھی احتمالِ نقص اور احوالِ رواۃ بھی غیر معتبر۔ اس لئے کہ "نفس اُن کے ساتھ لگا ہوا تھا اور نفسانی رجحانات سے وہ مبرا نہ تھے" اور یہ رجحانات فعلیت کے درجے میں بھی آتے رہتے تھے۔ تفہیمات مصنفہ مولانا مودودی ص ۹۱ سے دیکھ جائیے۔ خصوصاً فقہاءؒ۔ محدثینؒ۔ اور صحابہؓ کے باہم کلماتِ بدزبانی۔ سب و شتم۔ تضلیل و تحمیق اور تکذیب کے تذکار نے تو آزادیٔ افکار کے اس دورِ ضلال میں ان لوگوں کے دماغوں پر خوب ہی کام کیا جو پہلے سے حق و اہلِ حق کی حرمتوں اور عظمتوں کو اپنے قلب و دماغ کا بارِ گراں سمجھتے تھے۔ حالانکہ مولانا نے متفقہانہ احتیاط کے ساتھ متکلمانہ فکر سے اس جزو پر غور نہ فرمایا کہ جب انھی کے قول کے مطابق اسماء الرجال کے ذخیرے میں کونسی ایسی چیز ہے جس میں غلطی کا احتمال نہ ہو تو ان تاریخی روایات ہی پر کیا وثوق ہے جس میں ایسے ایسے جلیل القدر حضرات عام انسانوں کی طرح لڑتے اور ایک دوسرے پر سب و شتم کرتے اور طعن و تشنیع دیتے دکھائے گئے ہیں۔ اور کیا امت پر شفقت

اور اس کے آج کے احوال کی مصالح کو اس میں ملحوظ و مرعی رکھا گیا ہے۔ جبکہ اشراط ساعت لعن آخر ھذہ الامۃ اولھا کی فضا ہموار ہو رہی ہے۔؎۱

حضرت مجدد سرہندیؒ فرماتے ہیں کہ صحابہؓ کے متعلق کوئی ایسا تذکرہ ایسے انداز میں کہ جس میں ذرا بھی ایہام بے وقعتی ہو یا ان کی جلالتِ شان کے منافی ہو، حضرت اقدس جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے فائدے کو کم کرنے والا ہے۔ خبردار احتیاط کرو۔ حضورؐ کا ارشاد کہ جب میرے اصحاب کا ذکر آئے۔ خاموش ہو جاؤ۔ الصحابۃ کلھم عدول۔ میرے اصحاب دین میں سب ثقہ ہیں۔ قاضی عیاض شفا میں لکھتے ہیں "جاہل راویوں کی ان خبروں سے اعراض کرو جو صحابہ کی شان میں نقص پیدا کرنے والی ہیں۔ محمد رسول اللہ والذین معہ سے ان کی افضلیت ثابت ہے"۔

؎۱ اس جذباتی اپیل کی دل سے قدر کرنے کے باوجود سوال یہ ہے کہ آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ کیا سلف کا وقار قائم کرنے کے لئے آپ یہ دعویٰ کرنا چاہتے ہیں کہ نفس ان کے ساتھ لگا ہوا نہ تھا اور وہ نفسانی رجحانات سے مبرا تھے اور یہ رجحانات کبھی نفسیت کے درجے میں نہیں آئے؟ یا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جرح و تعدیل کا وہ پورا ذخیرہ غلط ہے جس میں یہ شہادتیں ملتی ہیں کہ بڑے بڑے لوگوں نے بڑے بڑے لوگوں کو مجروح کیا ہے؟ یا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اسماء الرجال کے ذخیرے میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس میں غلطی کا احتمال ہو؟ جب معاملہ ایک علمی مسئلے سے متعلق ہو تو اس کا فیصلہ جذباتی اپیلوں سے نہیں کیا جا سکتا۔ علم کی صحت کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم حقیقت کو بالکل بے لاگ طریقے سے سمجھیں اور مانیں خواہ وہ ہمارے لطیف حسیات کے لئے کتنی ہی ناگوار اور ہماری مصلحتوں کے لحاظ سے کتنی ہی ضرر رساں ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ روایت کے لحاظ سے نقدِ حدیث کے جس قدر ذرائع ہمارے پاس ہیں وہ مفیدِ علم یقین نہیں ہیں بلکہ ظن غالب ہی تک ہمیں پہنچا سکتے ہیں، اس لئے مجرد سند کی بنا پر کسی خبر واحد کی صحت کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کے ساتھ درایت سے بھی کام لینا ضروری ہے یہی بات ہے جسے "مسلکِ اعتدال" میں دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس مضمون پر مصنف کو گالیاں تو آج تک بہت دی جا چکی ہیں مگر اس کے دلائل اور مدعا کی غلطی آج تک واضح نہیں کی گئی۔

اللہ تعالیٰ معاف فرمائیں۔ اگر یہ سوءظن بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ میں داخل ہو۔ اس لئے کہ ہر سوءظن گناہ نہیں۔ بعض گناہ ہیں جن کے ساتھ قرائن قویہ ظنیہ غالبہ نہ ہوں۔ خیال یہ ہوتا ہے کہ چونکہ مولانا کو تنقید کا ذوق ہے ایسا کہ بعض دفعہ مناسب حدِ اعتدال اور اپنے مقتدیانہ مجددانہ منصب سے بھی تجاوز اور خروج سا محسوس ہونے لگتا ہے۔ اور اپنے ہم عصر علماء کے جبہ و دستار کے متعلق اور ان کے عواملِ خمسہ کی تعطیل کی خوبی تحقیق سے بھی گریز نہیں فرماتے اور سلفِ صالحین۔ بڑے بڑے ائمہ دقت بلکہ صحابہؓ کے متعلق بھی ایسے الفاظ لکھ جاتے ہیں۔ جو ممکن ہے واقعہ کے تو مطابق ہی کہیں ہوتے ہوں۔ اور اسی تقدیر پر منکر محسوس بھی ہوتے ہیں۔ ورنہ بہتان کہا جاتا۔ مگر کہنے والے کا منصب چونکہ اس سے فروتر ہے۔ اس لئے وہ "آں چناں می رود کہ زیبا می روی" سے بالکل مختلف ہو جاتے اور ذوق پر سخت گراں بار بن جاتے ہیں۔ آپ ہی خیال فرمائیے حضرات صحابہؓ کے متعلق یہ کہا جانا کہ گویا وہ اس طرح حدود اللہ سے صریح تجاوز کر رہے ہیں[1]۔ یا امام غزالیؒ کو فن حدیث میں ناقص کہنا اپنے کمال کے

---

[1] اس الزام کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ "حقوق الزوجین" میں ایلاء کے مسئلہ پر کلام کرتے ہوئے مصنف نے ایک جگہ اس سوال پر بحث کی تھی کہ چار مہینہ کی مدت گزر جانے کے بعد ایلاء کرنے والے کو رجوع کا حق باقی رہتا ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں اس نے صحابہ کے دو گروہوں کی مختلف آراء نقل کیں اور دونوں میں موازنہ کر کے اس گروہ کی رائے کو ترجیح دی جس نے رجوع کے حق کی نفی کی ہے۔ دوسرے گروہ کی رائے کے متعلق اس نے لکھا کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے بالفاظِ صریح ایلاء کرنے والوں کو صرف چار مہینے کی مہلت دی ہے، اس لئے یہ مدت گزر جانے کے بعد اس کو رجوع کا حق دینا اس مہلت میں اضافہ کرنا ہے اور یہ "اللہ کی مقرر کی ہوئی حد سے صریح تجاوز ہے"۔ یہ کتاب جب شائع ہوئی تو ایک عالم دین نے مصنف کو توجہ دلائی کہ یہ طرز بیان نامناسب ہے، اسے بدل دینا بہتر ہے۔ چنانچہ مصنف نے ان کے مشورے کو بلا تامل قبول کر لیا اور حقوق الزوجین کے دوسرے ایڈیشن میں عبارت کو بدل کر یوں کر دیا کہ "یہ اضافہ بظاہر کتاب اللہ کی مقرر کی ہوئی حد سے زائد ہے"۔ (ملاحظہ ہو حقوق الزوجین طبع دوم ص ۲۵) یہ چیز ہے جس پر اتنے بڑے الزام کی بنا رکھی گئی ہے کہ یہ شخص صحابہ کی توہین کرتا ہے اور انہیں حدود اللہ سے تجاوز کا مرتکب ٹھہراتا ہے۔ شاید یہ حضرات اس ایک فقرے کے سوا (جس سے رجوع کئے بھی برسوں گزر چکے ہیں) کوئی دوسری عبارت اپنے اس الزام کے ثبوت میں پیش نہیں کر سکتے۔

دعوے کو مستلزم نہیں تو کیا ہے؟ جو یقیناً ان کا منصب نہیں۔ باہم صحابہؓ یا باہم فقہا اور محدثین کے نزاع وجدال، سباب وطعان کو دہرانا اپنے ذوقِ تنقید کے بیانِ جواز کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ درحقیقت اُن کی مزاجی افتاد اس احترام کی خوگر ہی نہیں جس کے خوگر دوسرے لوگ ہیں۔ عامۃً ان کی جماعت کے لوگ سلف کی عظمت واحترام کی مزعومہ حد قائم کر کے دوسرے احترام پسندوں کو کہا کرتے ہیں کہ "یہ وہ لوگ ہیں جن کے سینوں میں اشخاص کے بُت نصب ہیں"۔ جو جاہلیتِ مشرکانہ کا اثر ہے۔ یہ بات ان لوگوں کے متعلق تو درست ہے جو حق پر رجال کو ترجیح دینے کے عادی ہوں۔ یا جو لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ کے منکر ہوں۔ ورنہ جو لوگ سیرِ سلف پر نظر رکھتے ہوں۔ جنھوں نے صحابہؓ کے احترامِ نبوت حتیٰ کہ بعض صحابہؓ کا فضلاتِ نبویؐ تک سے معاملۂ حرمت دیکھا ہے۔ پھر تابعین کا صحابہؓ کے مقابلے میں تذلل۔ تلامذہ کا اساتذہ کے مقابلے میں تکسر، منتسبین کا اپنے مشائخ سے تعامل دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ عظمت وحرمتِ اکابر افاضہ اور استفاضہ والوں میں کس قدر ضروری سمجھی گئی ہے اور مدارِ نفع اس پر کس قدر مرتب ہے۔ ہاں حدود ہر چیز کی ہیں جس کی تاکید حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو بھی فرمائی۔ اطرا رمادح والی حدیث اس کی دلیل ہے۔ حضورؐ نے عام اہلِ وجاہت کے لئے بھی ارشاد فرمایا اقیلوا ذوی الهيئات عثراتهم الا الحدود۔ یعنی صاحبِ حیثیت لوگوں کی لغزشوں سے چشم پوشی کرو۔ وہ اغضا جہاں سے حدود اللہ متاثر ہوں۔ جو حق سے متصادم ہوں۔ جہاں فص سے نفس کا اضمحلال لازم آئے یا جس جگہ مراتب امور کی قدریں متغیر ہونے لگیں البتہ قابلِ نکیر ہوگا۔ اس نوع کے اندازے کے لئے حضرت مجدد سرہندیؒ کا مکتوب نمبر ملاحظہ فرمائیے۔ ایک دفعہ ایک مدراسی عالم[1] جماعت کے مشہور امیر حلقہ مظاہر العلوم سہارنپور تشریف لائے۔ طلبائے دورہ کو بخاری لئے ہوئے دیکھا۔ بے ساختہ زمزمہ پیرا ہوئے۔ "کب تک یہ بخاری کے بُت لئے بیٹھے رہوگے۔ میدان میں آؤ"۔ حسنِ ظن سے کام لیا جائے

---

[1] غالباً یہ اشارہ مولانا صبغۃ اللہ صاحب بختیاری کی طرف ہے۔ جو بات یہاں ان کی طرف منسوب کی گئی ہے اس کی حقیقت وہی بتا سکتے ہیں۔

تو تاویل کی گنجائش ہے۔ کہ علم بہر علم کی روش ترک کرو۔ مگر الفاظ کی درشتگی اور عنوان کی بدنمائی اس اُفتادِ مزاجی کی خبر دیتی ہے جس کا ذکر ہے۔ صوفیائے کرام کے تذکرے ہیں ایک جگہ مولانا کے الفاظ ہیں کہ جو لوگ مشاہدۂ غیب کی تمنا رکھتے ہیں۔ ان کی حیثیت ایک نقب زن کی سی ہے جو اللہ کے حرم میں جھانکنا چاہتا ہو۔ ظاہر ہے کہ علم دو قسم کا ہے۔ ایک علم باللہ۔ دوسرے علم بالاحکام جیسا کہ قول حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہے۔ یہ علم باللہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ علوم استدلالیہ کو کشفیہ کیا جائے۔ اور اجمالیہ کو تفصیلیہ۔ جیسا کہ حضرت مجدد سرہندیؒ فرماتے ہیں۔ گویا دوسرے الفاظ میں صورِ علمیہ کو حقائق و بصائر اور حال و ذوق تک پہنچایا جائے۔ اور استدلال کی محدود عقلی شہر پناہ سے وجدان وکشف کی غیر محدود و بے پناہ سرحد تک متصل کیا جائے۔ محسوسات کی سرحد ادراک سے ماورائی ذروۂ سنام تک اس طرح پہنچائیں جہاں استدلال و تعقل کی حدیں مضمحل ہو کر راسخانہ اذعان میسر ہو۔ جو چون و چرا، کیف و کم اور تنقید و تفحص سے بلند ہو جس کو حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں۔ اگر الفاظ سے ظاہر کیا جائے۔ تو الفاظ و تعبیر کی تنگ دامانی واضح ہو جائے۔ اور لوگ میری تکفیر کریں۔ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں اگر میں ظاہر کروں تو میری شہ رگ قطع کر دیں قطع البلعوم۔ یہ علم اس علم پر اضافہ نہیں بلکہ [illegible] سے سمجھا گیا۔ اگر خدا نخواستہ [illegible] تو محض ضلال ہے۔ البتہ لکل شئ ظہر و بطن کے مطابق ظہر و بطن علم اور اسرار خفیہ ہیں۔ جو ایک صاحبِ ذوق اپنے جوہر شناسانہ ذوق ہی سے سمجھ سکتا ہے اور عارفِ محقق اپنے عرفان ہی سے اس پر مطلع اور اماراتِ خاصہ ہی سے اس کو تشخص کر سکتا ہے۔ اربابِ ظواہر اور اصحاب صحو محض اس کو کیا جانیں۔ اس غیب الغیب کے ذوق و جستجو اور حضور و اضطراب کا طالب امت کا ایک بڑا طبقہ صوفیاء جہال نہیں صوفیائے حق ہمیشہ رہا جو عقل غیاب نہیں بلکہ عشق حضور و اضطراب والوں کا حصہ ہے جس کے بیان و اظہار پر شیخ اکبر ابن عربیؒ جیسے مغلوب اور مجدد سرہندی جیسے غالب الحال دونوں قسم کے حضرات مجبور رہے۔ یہ حرم خداوندی میں نقب زنی نہیں۔ بلکہ احوال و نوائف اور اسرار و مواجید ہیں جس پر نہ تنقید کی ضرورت نہ رائے زنی کی حاجت۔ ان اسرار پر تبصرہ عوام کے قلوب میں اہلِ حق دعا...

کے متعلق سخت بدگمانیوں کا محرک ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کے ارشاد کے مطابق یہ عشاق کے صحیفے صرف لپیٹ کر رکھ دینے کی چیزیں ہیں۔ نہ انکار می کنم و نہ ایں کار می کنم کا تعامل ان کے ساتھ مناسب ہے۔ خلوت کے انفرادی احوال جلوت کی اسٹیج پر افشا و دعوت کے لئے نہیں ہوتے۔ ورنہ [illegible] حضرت مجدد سرہندیؒ ایسے حضرات کے ایسے اسرار کا رد و قبول دونوں خطرناک ہے۔ مگر مولانا کا ذوق یہ ہے کہ وہ ہر میدان میں شہسواری اور ہر سمندر کی غواصی کرنا چاہتے ہیں۔ اہلِ ظاہر کا ایسے موضوع پر کلام کرنا ایسا ہی ہے جیسا صوفیا کے جہال کا وحدۃ الوجود پر کلام کر کے وہ معانی بیان کرنا جو ضلال اور شرکِ قطعی ہیں، ضلوا فاضلوا۔ ایک کنارہ یہ ہے کہ اہلِ ظاہر اس پر تنقید کریں دوسرا کنارہ یہ ہے کہ جاہل صوفیاء اس کی تعبیر و تصریح کریں۔ نہ وہ محلِ تنقید نہ یہ مجاز تصریح۔ لپیٹ کر رکھ دو اور سکوت کرو۔ اعتراض ہو سکتا ہے کہ ان عارفین ہی کو ان اسرار کے افشا کی کیا حاجت تھی۔ کیوں نہ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی طرح اسرار کو اسرار ہی رکھا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت شیخ اکبر ابن عربی قدس سرہٗ نے صاف فرمایا کہ ہماری ان کتابوں کو ہر شخص نہ مطالعہ کرے۔ ان کو کیا خبر تھی کہ آئندہ چل کر پریس کی وسعت ان کی کتب کو عام کر دے گی خود حضرت امام غزالیؒ نے اپنی بعض کتب کو عوام کے نہ دیکھنے کی تاکید فرمائی۔ حضرت مجددؒ کے جو خطوط ہیں وہ اُن کے اہل کو لکھے اور خطاب کئے گئے ہیں۔

اس بیجا دخل در معقول کا نتیجہ ظاہر ہے۔ مجھے مولانا کی جماعت کے اکابر کے خیالات شیخ اکبرؒ اور مجدد سرہندیؒ کے بارے میں معلوم ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ مجدد سرہندیؒ شیخ اکبرؒ کے متعلق کس قدر احتیاط کرتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ایک سرا الجاحدون للتصوف کا ہے دوسرا الجہال من الصوفیہ کا۔ ایاک وایاھم۔

ایک جگہ حضرت مہدی علیہ السلام کا تذکرہ کرتے ہوئے ان احادیث کا انکار کر جاتے ہیں جو علاماتِ مہدیؑ کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ محدثانہ طریق پر ان احادیث کا پایۂ اعتبار کیا ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ ان احادیث کی علامات کو حافظ ابن حجر مکیؒ اور حضرت مجدد سرہندیؒ

کے ذوق نے معتبر مانا ہے۔ جیسا کہ مکتوبات دفتر دوم ص ۶۷، ۶۸ میں اس پر بحث فرمائی ہے۔" اگر ان حضرات کا ذوق مولانا کے نزدیک کسی درجے میں وقیع ہے اور امام غزالی کی طرح وہ بھی اس میں ناقص نہیں ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ مولانا مودودی باوجود اپنے اخلاص و نیک نیتی اور سچے جذبۂ خدمت دین رکھنے کے نیز سیاسی نظر و فکر اور موضوع ارتفاقات پر اچھی گہری نظر و بصیرت رکھنے کے موضوعات واقترابات میں اپنے اس فکری مزاج و قوام کے اعتبار سے امت مسلمہ کے لئے مفید نہیں۔ ہاں اپنی خصوصی متکلمانہ تعبیر و قابلیت کی جہت میں ملاحدہ و زنادقہ کے لئے ان کے لٹریچر کی افادیت کا انکار بے انصافی ہے۔ اگر مولانا صرف ایک سیاسی لیڈر ہوتے تو مضائقہ نہ تھا۔ ان کا ارتقائی تفکر مہدی سوڈانی، عبدالکریم مراقشی، جمال الدین افغانی سے زیادہ واضح اور مدلل ہے۔ مگر ان کی حیثیت مقتدایانہ، محدثانہ، فقیہانہ، مفسرانہ بھی ہے۔ اور معتقدین نے اب مجددانہ حیثیت بھی تسلیم کر لی ہے۔ جماعت اسلامی کی تاریخ بیان کرتے ہوئے مدیر کوثر لاہور نے ان کو اس صدی کا مجدد بنایا ہے (کوثر ۸۔ اگست ۱۹۴۶ء) آخری مجدد حضرت سید احمد شہید بریلوی قدس سرہٗ کی شہادت ہزارہ کے پورے سو سال بعد ان کے ظہور اور دعوت تجدید و احیاء سے ان کے مجدد مائۃ ہونے کا یقین دلایا ہے۔[۱] اب بات اہم ہو گئی۔ نبی کی دعوت پر لبیک کہنے والا مسلمان اور منکر کافر ہوتا ہے۔ مجدد کی

[۱] عجیب لطیفہ ہے کہ ۸۔ اگست سرے سے کوثر کی کوئی تاریخ اشاعت ہے ہی نہیں۔ ۹۔ اگست البتہ اس کی تاریخ اشاعت ہے، مگر ۴۶ء میں عید الفطر کی وجہ سے اس تاریخ کا پرچہ شائع نہیں ہوا تھا۔ تاہم احتیاطاً ہم نے اگست ۴۸ء، ۴۹ء اور ۵۰ء کی تمام اشاعتوں کو لفظ بلفظ پڑھ کر دیکھ لیا، مگر کہیں اس مضمون کا نام و نشان تک نہ پایا۔ پھر مدیر کوثر، جناب ملک نصر اللہ خاں صاحب عزیز سے دریافت کیا کہ ۱۰ سال سے قطع نظر، کیا کبھی ان کے قلم سے وہ "کلمات کفر" نکلے ہیں جن کا حوالہ ان متشرع و متدین بزرگ نے دیا ہے؟ مگر انھوں نے سن کر کانوں پر ہاتھ رکھے اور صاف انکار کیا۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ اس فرد قرارداد جرم میں یہ صریح الزام کس بنیاد پر درج ہوا ہے۔

دعوت پر لبیک کہنے والا متقی اور گریز کرنے والا فاسق ہو جاتا ہے۔ یہ مسئلہ اپنی جگہ پر مسلم ہے۔ اب ناممکن ہے کہ ان کے تفردات افکار، سیرت اور کردار آپ سے آپ پیروؤں میں سرایت نہ کریں۔ جیسا کہ خود مولانا نے اپنی ایک تحریر مطبوعہ جریدہ محمود میں لکھا ہے جبکہ ایک شخص نے مشرقی کی تحریکِ خاکساریت میں داخلے کی اجازت چاہی اس شرط پر کہ مشرقی کے عقائد و افکار سے کوئی علاقہ نہ رکھے گا۔ تو مولانا نے جواب میں کہا تھا کہ ایسی بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو عقل کے افلاس میں مبتلا ہو۔ آپ کسی تحریک میں داخل ہوں اور لیڈر کے خیالات، سیرت اور کردار سے متاثر نہ ہوں۔ یہ ناممکن ہے۔ لیڈر کے خیالات۔ افکار۔ کردار۔ سیرت تحریک کی جان ہوتے ہیں۔ الخ وغیرہ وغیرہ۔ اور مولانا کا اندازِ فکر و تحقیق یہ ہے جو مذکور ہوا۔ جو شخص سلف صالحین اور جمہور امۃ اور اہلِ حق کے مذاق سے کچھ بھی آشنا ہوگا وہ مولانا کے فکر و مذاق کو اس سے بہت مختلف پائے گا۔ ان کے لٹریچر کی خاصیت۔ سلف کی غیر شعوری تخفیف و تردید۔ اور اپنی شعوری تصویب و توثیق اور اعجاب رائے کے سوا کچھ نہیں جو نتیجۃً سوادِ اعظم سے نکلنے کے مترادف ہے۔ حیرت ہے کہ کل تک ماضی قریب ہی میں جو لوگ جیسے حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکیؒ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اکابر دیوبند جو ۱۸۵۷ء کے بعد اپنے تقوے۔ تورع۔ تفقہ خدمتِ دین۔ اماتتِ بدعت اور احیاءِ سنۃ کے اعتبار سے روشنی کے منارے سمجھے جاتے تھے۔ آج وہ غیر متبع سنۃ قرار دیئے جا رہے ہیں۔ ہندوستان کے امیر جماعت کی یہ تحریر میں نے خود دیکھی ہے[لہ]۔ کل تک جو لوگ جیسے خواجہ معین الدین اجمیری اور

لہ امیر جماعت اسلامی پاکستان کی تو کوئی ایسی تحریر پیش نہیں کی جا سکتی جس میں مذکورہ بالا بزرگوں کو "غیر متبع سنت" کہا گیا ہو، یا ان کی شان کے خلاف ہی کوئی بات کہی گئی ہو۔ رہے امیر جماعت اسلامی ہند، تو ان کی بھی کوئی ایسی تحریر ہماری نظر سے نہیں گزری۔ بہرحال چونکہ یہ الزام ان پر لگایا گیا ہے اس لئے اس کا جواب انھی کے ذمے ہے۔

خواجہ بختیار کاکیؒ جو تنہا ہندوستان میں شمعِ اسلام روشن کرنے والے اور ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے اس کفرزار میں تنویراتِ اسلام پھیلانے والے اور اپنی گرمیٔ رخسار سے محفلِ کفر و ظلمت کو پھونک دینے والے تھے۔ آج وہ جوگی اور سنیاسی تصور کئے جا رہے ہیں؎۱۔ حالانکہ یہ وہ لوگ تھے جن کے متعلق کہا جاتا کہ

أُولَـٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ — یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔ پس ہدایت میں انہی کا اقتدا کیجئے۔

یہ قاعدہ ہے کہ ایک نبی کے بعد دوسرا نبی پہلے کی تائید کرتا ہوا تصویب و توثیق اور تحسین کرتا ہوا آتا ہے۔ اسی طرح جانشینِ انبیاء مجددین ہیں جو ماقبل مجددین کی تائید، تکریم اور تصویب کرتے ہوئے آتے ہیں۔ مگر فلاسفہ اس سے مختلف ہیں۔ ایک آنے والا فلسفی، فلاسفۂ ماقبل کی تردید، تنقیص اور تخفیف کرتا ہوا آئے گا۔ سابق فلسفی کی تحمیق اور اس کے نظریات کی تردید اس کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے شبہ ہوتا ہے کہ مولانا ایک فلسفی ہیں اور فلسفیانہ ذوق کا یہ لازمہ ہے۔ رہے معتقدین جنہوں نے ان کو مجددیت کا مقام دیدیا ہے؎۲۔ تو اگرچہ یہ ایک خفی چیز ہے۔ امارات واضحہ ہی سے کچھ قیاس ہو سکتا ہے۔ بظاہر تو یہ اطرا درج معلوم ہوتا ہے جس میں لوگ ہمیشہ مبتلا رہے ہیں۔ عیسائیوں نے فرطِ عقیدت سے بندۂ خدا کو خدا بنا دیا۔ شیعوں نے فرطِ محبت سے اماموں کو ولایت سے گزار کر مقامِ نبوت تک پہنچا دیا۔ عامۃ معتقدوں نے اپنے مشائخ کو ارباباً من دون اللہ بنا لیا۔ ذرا کسی شخص میں غیر معمولی چیز اپنی فکر و پرواز سے زیادہ محسوس کی اور اس کو حسبِ فکر اقصیٰ مقام دے دیا۔

؎۱ کیا اس الزام کے ثبوت میں کوئی ایک فقرہ یا ایک لفظ ہی پیش کیا جا سکتا ہے؟

؎۲ یہ الزام پوری ہوشیاری کے ساتھ بار بار دہرایا جا رہا ہے، کیونکہ اس کے بغیر عوام کے جذبات بھڑکائے نہیں جا سکتے، مگر آج تک کسی نے ایسی کوئی شہادت پیش نہیں کی جس سے ثابت ہوتا ہو کہ شخص مذکور نے خود مجدد ہونے کا دعویٰ کیا ہو، یا جماعت اسلامی کے لوگوں نے اسے مجدد قرار دیا ہو۔ رہی یہ بات کہ کوئی یہ "خیال" رکھتا ہے، یا کسی نے ایسا "تصور" کر لیا ہے، یا کسی کو "یہ مقام دیدیا گیا ہے"، تو اس طرح کی باتیں جو لوگ دوسروں کے متعلق کہتے اور لکھتے ہیں، وہ شاید خود اپنے آپ کو عالم الغیب اور علیم بذات الصدور سمجھتے ہیں۔

کسی کو شعر کا پیغمبر اعظم بنایا کسی کو سیاست کا اوتار کہا کسی ادیب کو مجموعۂ ادب کا خالق کہہ گزرے۔ علامہ۔ فہامہ۔ امام الائمہ القاب تو روزمرہ کی تقسیم ہے[^1]۔ غرض چونکہ اصلی مالک الملک۔ علام و قہار فاعلِ مختار کی سطوت و جبروت عظمت و کبریائی سے ذوق آشنا نہیں۔ ساری صفاتِ علیا مخلوق میں تقسیم کرنے

[^1]: لہ بولنا نہیں تو ایک سوال ہم بھی پوچھ لیں۔ ابھی ابھی ایک محترم شخصیت کو "جامع المجددین" کا جو لقب دیا گیا ہے اس کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟ دوسروں کے تو قول و فعل نہیں بلکہ خیال پر بھی گرفت ہے، اور خیال بھی وہ نہیں جس کا آپ کو علم ہو بلکہ وہ جو آپ نے اپنے گمان کی بنا پر ان کی طرف منسوب کر دیا ہو، لیکن آپ کے گروہ میں علی الاعلان ایک بزرگ کو جامع المجددین کہا گیا اور ان کے کارناموں کا مجموعہ اسی نام سے شائع کیا گیا، اس پر بھی کسی نے کوئی قباحت محسوس نہ فرمائی۔ سوال یہ ہے کہ کیا کچھ مخصوص حقوق آپ لوگوں نے رجسٹرڈ کرا رکھے ہیں؟ فاضل ناقد جس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں وہ اپنے ہاں کی شخصیتوں کو بڑے بڑے القاب و خطابات کے ساتھ مشتہر کرنے، اور انتہائی مبالغہ آمیز طریقے سے ان کی مدح و ثنا کرنے میں ممتاز ہے۔ آپ اس گروہ کی مطبوعات اٹھا کر دیکھیے۔ ان میں آپ کو جگہ جگہ یہ القاب ملیں گے۔ قطب وقت، راس الفقہاء، قدوۃ الفقہاء والمحدثین، شیخ المشائخ، شیخ الکل، شمس العارفین، زبدۃ الفضلاء والمتکلمین، راس اہل البر والتقی، رئیس اصحاب المجد والنہی، تاج الملت، سراج الامت، شمس سماء التحقیق، مخزن العلوم، مرجع الکمالات۔ وغیرہ۔ دوسری طرف جماعت اسلامی کی تمام مطبوعات، رسائل اور اخبارات اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ یہاں ان شاء اللہ کوئی چیز آپ ایسی نہ پائیں گے جس سے یہ محسوس ہو کہ یہ لوگ اپنے گروہ کی بعض خاص شخصیتوں کا نام اچھالنے اور ان کی عظمت قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلکہ اس کے برعکس صریح طور پر آپ یہ دیکھیں گے کہ اس جماعت نے شخصیت پرستی کے ایک ایک منفذ کو بند کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنے رہنماؤں کے ساتھ اس کا معاملہ پاکستان و ہندوستان کی تمام سیاسی و مذہبی جماعتوں سے بالکل مختلف ہے اس پر یہ حال ہے کہ اگر کبھی اتفاقاً جماعت اسلامی کا کوئی شخص اپنے کسی رہنما کے لیے کوئی کلمہ مدح و تحسین لکھ بیٹھتا ہے یا زبان سے نکال دیتا ہے تو وہ ہمارے متشرع و متدین بزرگوں کے لیے اس قدر ناقابلِ برداشت ثابت ہوتا ہے کہ برسوں وہ اس کے رنج میں تڑپتے رہتے ہیں اس کے تراشے سنبھال کر رکھتے ہیں اور لوگوں کو دکھاتے پھرتے ہیں، اور جب موقع ملتا ہے اس شان سے دل کا بخار نکالتے ہیں جس کا ایک ادنیٰ سا نمونہ اس تحریر میں آپ دیکھ رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ محض تنگ ظرفی ہے یا اس کے ساتھ کچھ اجارہ داری کا جذبہ بھی شامل ہے؟

کے لئے بے چین ہیں۔ غور کیجیے تو اس اطراء و مدح میں جذبۂ شرک کی پنہانی کارفرما ہے اور نیز اپنا احساس کمتری کسی برتر محسوس کے سایۂ عطوفت کا جویاں ہے۔

شاید میں ذرا تجاوز کر گیا۔ استغفر اللہ۔ ثُمَّ اتَّقُوا ثُمَّ تُسْلِمُوْنَ رَحْمَۃَ رَبِّکَ۔ تم معترض ہونے والے کون۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں۔ اگر واقعی ایسا ہے تو ہمیں بھی اہلِ حق کی تائید و نصرت سے محروم نہ فرمائیں۔ اور مَنَّاعٍ لِّلْخَیْرِ ہونے کے مظلمہ سے بچائے۔ یا ہماری قلتِ نظر و نقصِ فہم کو اعتذار میں قبول فرمائے۔[۱] بادر دکشاں ہر کہ درافتاد برافتاد، ما تجربہ کردیم دریں دورِ مکافات۔ کے خوف سے واللہ فارغ نہیں ہوں۔ ورنہ تو امت کو اُن کی اجتہادی اغلاط کے ضرر سے بچائے۔

میں نے سُنا جب وہ جیل سے رہا ہو رہے تھے۔ تو اُن کو مع رفقا کے اُن کے علم و اطلاع میں لاکر فوٹو بھی لیا گیا۔ اگر یہ صحیح ہے تو تعجب ہے۔ اس لئے کہ مجھ کو یہ معلوم ہے کہ فوٹو کی حُرمت پر اِن کی رائے اہلِ حق سے مختلف نہیں۔ پھر ایسا کس طرح ہوا۔ کیا ان کی طرف سے اس پر نکیر نہیں ہوا؟[۲]

اس سب کے باوجود نفسِ تحریک۔ اقامتِ دین و دستورِ اسلامی کی سعی یقیناً مشکور ہے اس کی مخالفت منشائے حق کی مخالفت ہے جس طرح ممکن ہو۔ تائید و نصرت سے گریز نہ کیا جائے۔[۳]

معافی چاہتا ہوں۔ تحریر طویل ہو گئی۔ اور استغفار کرتا ہوں۔ اگر حد سے نکل گیا ہوں اللہ تعالیٰ

---

[۱] جزاک اللہ اس تقویٰ کے قربان جایئے۔ سب کچھ فرما چکنے کے بعد اب حضرت کو "شاید ذرا تجاوز کر جانے" کا احساس ہوا، اور اس احساس نے بھی جناب کو پچھلے ارشادات کی طرف پلٹ کر دیکھنے کے بجائے اگر کسی بات پر ابھارا تو وہ یہ کہ استغفر اللہ کہنے کے بعد چلتے چلتے ایک چوٹ اور کر جائیں۔

[۲] شاید حضرت کو اس موقع پر اپنے گروہ کے اکابر کی وہ تصویریں یاد نہیں رہیں جو بارہا اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں۔

[۳] اس سے بڑھ کر تائید و نصرت اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ نے یہ مضمون لکھا اور آپ کے گروہ مقدس کے بہت سے بزرگ ماشاء اللہ انتہائی شانِ تقویٰ کے ساتھ اکثر خفیہ و علانیہ اسی طرح کی تائید و نصرت فرماتے رہتے ہیں۔ جزاکم اللہ عنا جزاءً وفاقًا۔

میری، آپ کی، مولانا اور اُن کے رفقاء کی مغفرت فرمائے اور اغلاط پر متنبہ فرما کر راہِ سوی پر چلائے۔ آمین۔ فقط والسلام۔

تتمہ

اوپر کا مضمون موصول ہونے کے بعد ایک مدت گزر چکی تھی کہ صاحبِ مضمون کی طرف سے اس کا یہ تتمہ بھی موصول ہوا جس کو انھوں نے خود "روحِ مضمون" سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس کے ساتھ انھوں نے اپنا نام بھی ظاہر فرمایا اور پورا مضمون اپنے نام سے شائع کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اس کے ساتھ ان کی ہدایت ہے کہ اس تتمہ کو ان کے مضمون کے اس حصے کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے جہاں انھوں نے مودودی کو ایک فلسفی ثابت کیا ہے اور ایک داعی حق سے اس کی حیثیت مختلف قرار دی ہے۔ یہ تتمہ حسبِ ذیل ہے:-

ایک خصوصی بات جو گاہ بگاہ موجبِ خلجان ہوتی ہے، یہ بھی ہے جو شاید بعض تقشف پسند معقولی دوستوں کے لئے میرے وہمی یا کم فہم ہونے کی دلیل ہو۔ مگر [illegible] قلبی خشیت۔ حدیث میں آیا ہے: إن الله إذا أحب عبداً دعا جبريل فقال إني أحب فلاناً فأحبه فيحبه جبريل. ثم ينادي في السماء فيقول إن الله يحب فلاناً فأحبوه فيحبه أهل السماء ثم يوضع له القبول في الأرض۔

اس حدیث کا منشا رجال کے حق و قبولیت کا معیار بتلانا ہے۔ مقبول عند اللہ کی مقبولیت خواص سے شروع ہو کر عوام تک پہنچتی ہے۔ برعکس مولانا مودودی کو بھی غالباً یہ کھٹک محسوس ہوئی۔ چنانچہ ایک جگہ اشارات میں انھوں نے لکھا ہے[1] "تعجب ہے کہ ہماری دعوت و تحریک پر لبیک کہنے والے زیادہ تر وہی لوگ ہیں جو ہندوستان کے قبرستانوں سے موت کی سند لے کر نکلے ہیں یعنی کالجوں اور یونیورسٹیوں کے فضلا اور گریجویٹ"۔ اور واقعہ بھی یہی ہے۔ رہے وہ لوگ جو کم از کم ہماری علم و اطلاع میں اپنے علم و عمل، فکر و اخلاص، تجرد و تدین، رائے اور یمین کے اعتبار سے عظیم القدر ہیں اور جن کی

[1] یہ جناب کا حسنِ ظن ہے کہ وہ اشارات اس احساس کی بنا پر لکھے گئے تھے۔ توجیہ القول بما لا یرضیٰ قائلہ کی یہ ایک عجیب مثال ہے۔

تاریخ نشاۃ عبادات الانبیاء و شہدا کی مصداق ہے وہ اب تک بالکل یکسو اور غیر متوجہ ہیں۔ حالانکہ اُن میں وہ لوگ بھی ہیں جن کی زندگیاں لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا کی پیہم جدوجہد کی شاہد بھی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اُن کے طریقِ کار سے کسی کو اختلاف ہو۔

اس سے یہ خیال نہ فرمائیں کہ میں حق کو رجال سے پہچاننے کے حق میں ہوں۔ اصل یہی ہے کہ حق سے رجال کو پہچانا جاتا ہے۔ بشرطیکہ حق شناسی موجود ہو۔ مگر اس جگہ مضمونِ حدیث اول خواص میں مقبول ہونا پیشِ نظر ہے جو یہاں مفقود ہے۔ کل تک جو لوگ یا رائے سے کورے تھے۔ یا یمین میں کورِ علم و فکر سے عاری تھے یا تقویٰ و تورع سے فارغ۔ ختمِ نبوت میں مذبذب تھے۔ یا خاکساریت کے علمبردار۔ نیچریت سے مسموم تھے یا الحاد کے شکار۔ وہی متوجہ ہو رہے ہیں۔ اہلِ علم و تقویٰ گویا روشناس ہی نہیں۔ یا مدارس عربیہ کے چند نئے نئے فارغ شدہ جو زمانہ تحصیل میں بھی بخاری بدوش اور کمیونزم بر کف تھے۔

یا پھر یہ فیصلہ کیجئے کہ یہی لوگ سوسائٹی کا مکھن تھے جو ندائے حرم پر لپک پڑے اور جن کو ہم نے خواص سمجھا وہ ہماری علم و اطلاع اور معرفت کا قصور تھا جس پر نظرِ ثانی ضروری ہے۔ نیز اپنے معیارِ حقانیت کا جائزہ بھی ضروری ہوگا۔ ایسا تو نہیں کہ خرد کا نام ہم نے جنوں رکھ دیا ہو اور جنوں کا خرد۔ اور کشفِ غبارِ حجاب پر تحت رجل کچھ اور ہی خلافِ توقع سامنے آئے جس کے لئے ہم بالکل تیار نہ ہوں۔ بہر حال یہ جو کچھ عرض کیا بدرجہ مخطور ہے نہ دلیل۔ اور دل چاہے تو فتنہ سمجھ لیجئے مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔

جواب

از جناب مولانا امین احسن صاحب اصلاحی

اس تحریر میں جماعت اسلامی پر جو الزامات عائد کئے گئے ہیں ان پر گفتگو کرنے سے پہلے میں صاحبِ تحریر بزرگ اور ان کے انداز پر سوچنے والوں کے اس عجیب و غریب طرزِ فکر پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جس میں یہ حضرات مبتلا ہیں۔

ایک طرف تو یہ حضرات ایک شخص کی نسبت یہ رائے رکھتے ہیں کہ اس کی تحریریں سلف کی "تنقیص وتحمیق" اور اپنی تصویب وتوثیق اور اعجابِ رائے کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں۔ اور دوسری طرف یہی فرماتے ہیں کہ اس کی دعوت اور اس کے لٹریچر سے "ایک ایسا طبقہ دین سے آشنا ہو رہا ہے جس کا دین کی طرف میلان دشوار تھا"۔ ایک طرف تو ایک شخص کی تحریروں کا نتیجہ ان حضرات کے خیال میں یہ نکل رہا ہے کہ "لوگ سوادِ اعظم سے کٹتے جا رہے ہیں"۔ دوسری طرف اُسی شخص کی تحریروں کی یہ برکت بھی بیان کی جا رہی ہے کہ "وہ اُس طبقے کے ریب وتشکیک یا جحود وانکار کو تصدیق واثبات کی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہے جو الحاد کی دلدل میں پھنسا ہوا تھا"۔ ایک طرف تو ایک پوری جماعت کی جماعت کے علم وفضل پر ان کا یہ تبصرہ ہے کہ "ان میں ایک عالم بھی ایسا نہیں ہے جس کا علم وتفقہ تفصیلی مسائل میں لائق اعتماد ہو"۔ دوسری طرف اُسی جماعت کی نسبت یہ ارشاد بھی ہے کہ "دین کے خلاف اور مذہب سے متصادم جو تحریکیں آج چل رہی ہیں اور قومیت وطنیت اور کمیونزم وغیرہ کی راہ سے سامنے آ رہی ہیں، ان کے مقابلے کے لئے وہ پوری طرح مستعد ہے"۔ اور ان سب سے عجیب تر بات یہ ہے کہ ایک شخص کو یہ حضرات ایک مفسّر، ایک محدّث، اور ایک فقیہ کی حیثیت سے تو ایک لمحہ کے لئے بھی گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، لیکن اگر وہی شخص ایک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے ان کے سامنے آئے تو اس کو اپنا امام بنا لینے کے لئے بالکل تیار ہیں۔

فکر ونظر کا یہ انتشار ایک طرف تو ان حضرات کی ایک بہت بڑی نفسیاتی کمزوری کا پتہ دے رہا ہے۔ دوسری طرف اس سے اس بات کی بھی شہادت ملتی ہے کہ اسلام کے متعلق اُن کا تصور اُس تصور سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے جو عیسائی اپنے مذہب کے متعلق رکھتے ہیں۔

اُن کی نفسیاتی کمزوری تو یہ ہے کہ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی سے ان لوگوں کو جو خلش ہے وہ اس بات کی وجہ سے ہرگز نہیں ہے کہ خدانخواستہ ان کے ہاتھوں اسلام کو کوئی نقصان پہنچ رہا ہے۔ بلکہ ساری خلش اس بات کی وجہ سے ہے کہ مولانا مودودی کی تحریروں اور جماعت کی دعوت سے خود ان کے حلقہائے عقیدت بھی متاثر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اگر ان حضرات کو

اس بات کی طرف سے اطمینان ہو جائے کہ ان کے اپنے حلقے جماعت کی اثر اندازیوں سے محفوظ رہیں گے تو پھر مولانا اور ان کے رفقا جو چاہیں کہتے پھریں، انشاء اللہ سب خیر و برکت اور خدمت و اعانتِ دین ہے۔ ورنہ آخر اس کے کیا معنی کہ جو شخص ان کے خیال کے مطابق مسلمانوں میں ایک نئے فرقے کی بنا ڈال رہا ہے، جو کتاب، سنت اور سلف کے استنباطات پر نظر رکھنے کے باوجود خود بھی اجتہاد کا زعم رکھتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے دماغ میں بھی اجتہاد کی ہوائے خود سری بھر رہا ہے، جس نے تصوف و احسان سے، اور اس کے اساطین و عمائد کے خلاف لوگوں کے اندر نفرت و تحقیر کے جذبات پیدا کئے ہیں، جس نے حدیث کے وقار کو بہت حد تک کم اور سلف کے وقار کو بہت حد تک گرا دیا ہے، "جو اپنے ہم عصر علماء کے جبہ و دستار کے مسخرے اور ان کے حواسِ خمسہ کی تعطیل و تحمیق سے بھی گریز نہیں کرتا" جو بسا اوقات بڑے بڑے ائمہ وقت بلکہ صحابہ کے متعلق بھی ایسے الفاظ کہہ جاتا ہے جو بعض حالات میں "بہتان" قرار دیئے جا سکتے ہیں ——— اسی کو اور اس کے ساتھیوں کو اس بات کی چھوٹ دی جا رہی ہے کہ وہ نئے تعلیمیافتہ لوگوں، نئی درسگاہوں اور جدید تحریکات کے علمبرداروں اور ان کے پیروؤں کے اندر جو چاہیں پوری آزادی کے ساتھ پھیلاتے پھریں۔ کیا یہ مسلمان سوادِ اعظم کے اجزا نہیں ہیں، اور ان کو سوادِ اعظم کے جسم سے کاٹ کر الگ کر دینے میں کوئی گناہ نہیں ہے؟ کیا اس گروہ کے اندر اجتہاد کی ہوائے خود سری اگر بھر گئی تو اس سے "اعجاب کل ذی رائے برایہ" کا فتنہ اس امت میں نہیں برپا ہو جائے گا؟ کیا یہ بیچارے تصوف و احسان کی برکتوں اور اکابر امت کے ساتھ عقیدتمندیوں کے محتاج نہیں ہیں کہ ان کو ایسے بے دینوں کے حوالے کیا جا رہا ہے جو ان کو نہ صرف علمائے امت ہی سے بلکہ صحابہؓ تک سے بدگمان کر کے رکھ دیں گے؟ کیا یہ گروہ "افترابات" کی ضرورت سے بالکل مستغنی ہے کہ اس کو صرف "ارتفاقات" ہی پڑھایا جا رہا ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ بھی اگر اسلام کے محتاج ہیں تو اسی اسلام کے محتاج ہیں جو اصلی اور صحیح اسلام ہے۔ ورنہ ایک مرتبہ اگر یہ غلط اسلام کے راستے پر ڈال دیئے گئے اور ان کو کسی غلط قسم کے آدمی یا غلط قسم کی جماعت کے تحت

منظم ہو جانے کا موقع دے دیا گیا تو یہ بھی اسی طرح اس امت کے لئے فتنہ بن سکتے ہیں جس طرح کوئی اور گمراہ فرقہ بن سکتا ہے۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے یہ بزرگ علما ایک طرف تو مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کے اندر اتنے بے شمار خطرے گنتے ہیں لیکن دوسری طرف اس امت کا سارا ذہین طبقہ انھی کو الاٹ کئے دے رہے ہیں کہ ان کو وہ جس طرح چاہیں استعمال کریں۔ ایک طرف احتیاط بلکہ تنگ نظری کا یہ عالم ہے کہ ہماری چھوت تک سے مسلمان پلید ہو جاتا ہے اور دوسری طرف یہ فیاضی ہے کہ سارا ذہین طبقہ ہماری چراگاہ بنا کے چھوڑ دیا گیا ہے؟

غور کیجئے کہ اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ ہمارے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حضرات کبھی مسلمانوں کے معاملات پر اسلام کے نفع و نقصان کے پہلو سے غور کرنے کے عادی نہیں ہیں بلکہ ہمیشہ اپنے گروہ اور اپنے دھڑے کے نفع و نقصان کو سامنے رکھ کے غور کرتے ہیں۔ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کی دعوت سے ان کے عقیدت کیشوں کی عقیدت مندیاں متزلزل ہو رہی ہیں اور ان کے دھڑے کے آدمی ٹوٹ رہے ہیں۔ اس وجہ سے اس دعوت کے اندر ان کو بہت سے کیڑے نظر آتے ہیں اور یہ ان کو کرید کرید کے اپنے عقیدت مندوں کے سامنے رکھتے ہیں کہ کہیں بے خبری میں ان میں سے کوئی اس غذا کو نہ چکھ لے۔ باقی رہے دوسرے مسلمان جن کی نسبت ان حضرات کو یہ یقین ہے کہ اب وہ نئی تعلیم کی بدولت ذہنی اعتبار سے اس قدر متغیر ہو چکے ہیں کہ ان کی طرف کبھی رخ بھی نہیں کرنے کے، اُن کے خیر و شر سے اِن کو کوئی بحث نہیں ہے۔ اُن کو جس کا جی چاہے جس راہ پر لگا دے۔ جب وہ اِن کے نہیں بنتے تو اُن کو کالا چور لے جائے۔ اِن کی بیزاری سے یہاں تک کہ مودودی صاحب جیسا آدمی بھی (جس کے کام کے اندر اسلام اور مسلمانوں کے لئے، ان حضرات کے نزدیک اتنے خطرے چھپے ہوئے ہیں) اگر وہ ان کو اپنے گرد جمع کرے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے، یہ بھی اسلام ہی کی خدمت ہو گی۔

اگر ان حضرات کے سوچنے کا انداز اسلامی ہوتا اور فی الواقع مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کے کام کے اندر یہ حضرات وہی خطرے محسوس کرتے ہوتے جن کا صاحب تحریر نے اتنے سنجیدہ

لب ولہجہ میں ذکر فرمایا ہے تو یقیناً یہ نہ صرف اپنے مریدوں کو بلکہ تمام مسلمانوں کو، بلکہ تمام انسانوں کو اس فتنے سے بچانے کی کوشش کرتے۔ مگر ان حضرات کے پیش نظر صرف یہ چیز ہے کہ اس دھارے کا رخ اپنی جاگیر کی طرف سے ہٹا کر کسی اور طرف موڑ دیں اور اپنی انصاف پسندی کا مظاہرہ کرنے کے لئے نہایت ثقاہت کے انداز میں مسلمانوں کو یہ بتا دیں کہ ہے تو یہ دھارا بہت خطرناک لیکن اگر اس کا رخ فلاں سمت کی طرف مڑ جائے تو اس میں کچھ پہلو فوائد کے بھی ہیں۔ یہ ہمارے ان بزرگوں کا تورّع ہے۔

اسلام کے متعلق ان حضرات کا جو تصور ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ جس شخص کو یہ ایک مفسر اور فقیہ کی حیثیت سے ایک لمحہ کے لئے بھی قبول کرنے پر تیار نہیں ہیں اُسی شخص کو ایک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے سر آنکھوں پر بٹھانے کے لئے تیار ہیں۔ "اقربات" کی میزان میں جو شخص ان کے نزدیک پاسنگ کے برابر بھی نہیں ہے اسی شخص کو یہ "ارتفاقات" کی میزان میں پورا من بھر قرار دے رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ارتفاقات (اجتماعیات) کو اقربات (وسائل قرب الٰہی) سے الگ کر کے دیکھنے کا یہ انداز ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ سے نہیں سیکھا گیا ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں تو کسی شخص کا ارتفاقات میں بھی درجہ معین کرنے کے لئے سب سے پہلے یہ دیکھا جاتا تھا کہ اقربات میں اس کا درجہ کیا ہے۔ اور اگر اقربات میں اس کا پلہ ذرا بھی ہلکا نظر آتا تھا تو اسی کے بقدر اس کا پلّہ ارتفاقات میں بھی ہلکا قرار دے دیا جاتا تھا۔ اس لئے کہ اسلام نے اس کو پسند نہیں کیا ہے کہ دونوں چیزوں کو الگ الگ کر کے دیکھا جائے۔ اسلام میں دین و دنیا کی تفریق نہیں ہے اور نہ قیصر اور خدا کے الگ الگ دائرے ہیں۔ یہاں جس طرح انفرادی زندگی خدا اور شریعت کے تحت ہے اسی طرح اجتماعی اور سیاسی زندگی بھی خدا اور رسول کے احکام کے تحت ہے۔ اس لئے جس طرح خانقاہوں اور درسگاہوں کا نظام ان لوگوں کے حوالے نہیں کیا جاسکتا جو خدا ناشناس ہوں اُسی طرح حکومت کا انتظام بھی ان لوگوں کے سپرد نہیں کیا جاسکتا جو خدا اور اس کی شریعت کو اچھی طرح جاننے والے اور صدقِ دل سے ماننے والے نہ ہوں۔ لیکن ہمارے ان بزرگوں کا دین چونکہ عیسائیوں کے دین کی طرح اجتماعیات سے بے تعلق ہے اس وجہ سے یہ اس بات پر راضی ہیں کہ مودودی صاحب ان کے

اجتماعی و سیاسی لیڈر شوق سے بن جائیں اگرچہ دینی و شرعی نقطۂ نظر سے وہ قطعی گردن زدنی ہیں۔ ہمارے ان بزرگوں کے اسی راہبانہ نقطۂ نظر کا یہ فیض ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعی اور سیاسی زندگی سو فی صدی ایسے لیڈروں کے قبضے میں چلی گئی جو نہ صرف خدا کی شریعت سے منحرف ہیں بلکہ خدا کے بندوں کو اس کی شریعت سے منحرف کرنے والے بھی ہیں۔ اور انھوں نے سیاسی طاقت حاصل کرنے کے بعد مسلمانوں کی پوری زندگی کو جاہلیت کے رنگ میں رنگ دیا ہے۔ صاحب تحریر بزرگ بھی اسی عام نظریہ کے مطابق مودودی صاحب کے لئے یہ حق تو تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ایک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے مسلمانوں پر مسلط ہو جائیں اور بے خدا سیاست شوق سے چلائیں لیکن یہ بات ان کو کھلتی ہے کہ وہ مذہبی اصولوں پر ایک جماعت بنائیں اور اس کے امیر کی حیثیت سے مسلمانوں کی ساری انفرادی، اجتماعی، اور سیاسی زندگی کو مسلمان بنانے کی جدوجہد جاری کریں۔ اس میں ان کو بے شمار خطرے نظر آتے ہیں۔

یہاں دل میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ صاحب تحریر بزرگ نے جس فن ارتفاقات (اجتماعیات) میں مودودی صاحب کو ازراہ عنایت ایک اونچا مقام عنایت فرمایا ہے اس کے اصول و فروع قرآن و حدیث ہی سے ماخوذ ہیں یا مغربی فلاسفۂ سیاست سے؟ اگر قرآن و حدیث ہی سے ماخوذ ہیں تو یہ امر تعجب انگیز ہے کہ ایک شخص کے بارے میں ایک طرف تو یہ تسلیم کیا جائے کہ قرآن و حدیث میں اتنا درک رکھتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو موجودہ زمانے میں یہ بتانے کا اہل ہے کہ اسلام ان کی اجتماعی و سیاسی زندگی کے لئے کیا اصول اور کیا ضابطے دیتا ہے اور اپنی اجتماعی اور قومی حیثیت میں وہ کس طرح اپنے رب سے ٹھیک ٹھیک جڑ سکتے ہیں لیکن دوسری طرف اسی شخص کو اتنا نااہل سمجھا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو یہ نہیں بتا سکتا کہ ان کے مختلف حالاتِ زندگی کے لئے شریعت کے احکام کیا ہیں، اور وہ اپنی انفرادی زندگیوں میں کس طرح اپنے رب کی معیت حاصل کر سکتے ہیں۔ معلوم نہیں ان میں سے زیادہ مشکل کام پہلا ہے یا دوسرا؟

اور اگر مودودی صاحب کے یہ ارتفاقات مغربی جاہلیت ہی سے ماخوذ ہیں تو پھر صاحب تحریر

بزرگ سے باادب گزارش ہے کہ آخر وہ کس بنا پر ایک ایسے شخص کی سیاسی قیادت تسلیم کرنے کے لئے تیار رہیں جو اپنے سیاسی و اجتماعی نظریات میں مغربی فلاسفہ کا مرید ہے؟ کیا ہمارا دین اجتماعی اور سیاسی زندگی سے متعلق ہم کو نہایت تفصیلی ہدایات نہیں دیتا؟ اور کیا وہ ہدایات ہمارے لئے اُسی طرح واجب التعمیل نہیں ہیں جس طرح وہ ہدایات واجب التعمیل ہیں جو ہماری انفرادی زندگیوں سے متعلق ہیں؟

بہرحال جماعت اسلامی اور اس کے امیر کو تھوڑا بہت ... جو یہ حضرات دیتے ہیں اس میں بھی ہمارے لئے کوئی پہلو شکستگی کا نہیں ہے بلکہ یہ بھی ان حضرات کی ژولیدہ فکری اور ایک بڑی حد تک ان کے احساسِ کمتری کا نتیجہ ہے۔

ان تمہیدی معروضات کے بعد اب آپ اُن الزامات پر ایک ایک کرکے غور فرمائیے جو پوری متقیانہ شانِ احتیاط کے ساتھ اور تو بہ و استغفار کرتے ہوئے ہم پر لگائے گئے ہیں۔

(۱) سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ جماعت ایک فرقہ بنتی جارہی ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ "جماعت کے حلقے میں یہ زعم پیدا ہورہا ہے کہ دین، دین کا فہم، دین کا درد، دین کا شعور بس اس جماعت میں محدود اور اسی دائرے میں مخصوص ہے۔"

اس الزام کے متعلق گزارش ہے کہ اول تو صاحبِ تحریر بزرگ کو یہی پتہ نہیں ہے کہ دنیا میں کوئی فرقہ کس طرح بنا کرتا ہے۔ محض اتنی سی بات سے کہ کچھ لوگ اس زعم میں مبتلا ہیں کہ دین کا علم بس ہمارے ہی پاس ہے اور ہم ہی اسلام کی خدمت کررہے ہیں، وہ ایک فرقہ نہیں بن جاتے۔ اس کو ایک سخت قسم کی بدخوئی غلطی کہہ لیجیے، غرور بھی کہہ لیجیے، مگر یہ کہنا بڑی زیادتی ہے کہ انھوں نے اپنا ایک الگ فرقہ بنا لیا ہے۔ اگر اس طرح سے فرقے بن جایا کریں تو پاکستان اور ہندوستان کے جتنے علما اور مشائخ اپنے الگ دائرے بنا کر کام کررہے ہیں سب کو الگ الگ فرقوں کا بانی قرار دینا پڑے گا۔ کیونکہ ان میں سے ایک شخص بھی شاید ایسا نہ نکلے جو یہ نہ سمجھتا ہو کہ جو کام وہ کررہا ہے کوئی دوسرا نہیں کررہا ہے۔ اور اگر اپنی نیک مزاجی کی وجہ سے وہ دوسروں کو

بھی کچھ وزن دے رہا ہے تو کم از کم اس کے معتقدین اور مریدین تو ہرگز اس بات کو گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ ان کے "حضرت" کے سوا کسی اور کو بھی دین کا فہم اور دین کا علم حاصل ہے۔ پھر کیا یہ سب کے سب الگ الگ فرقے ہیں؟ خود صاحب تحریر نے بھی اپنے اسی مراسلے میں جگہ جگہ بڑی دور کی لی ہے۔ خصوصاً تصوف پر بحث کرتے ہوئے تو ان پر انا ولا غیری کا اتنا نشہ چڑھ گیا ہے کہ شیخ ابن عربی کا سکہ بھی ان کے سکر کے آگے صحو بن کے رہ گیا ہے۔ لیکن محض اتنی بات کی وجہ سے ہم یہ نہیں سمجھتے کہ موصوف بھی کسی خاص فرقے کے بانی بن گئے ہیں بلکہ اس کو محض تنگ ظرفی پر محمول کرتے ہیں جو ایک بیماری ہے اور بہتوں کو لاحق ہو جایا کرتی ہے۔

فرقہ بننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ مسلمانوں کے اندر کوئی جماعت یا تو عقائد میں کوئی ایسی بات ایجاد کر لے جو کتاب و سنت کے بتائے ہوئے اور سوادِ اعظم کے اختیار کئے ہوئے عقائد سے مختلف ہو یا دین کے جو معروف اور مسلّم ماخذ ہیں اُن کے سوا اپنے لئے کوئی اور بھی ماخذ قرار دے لے۔ الحمدللہ صاحب تحریر بزرگ نے بعض دوسرے بزرگوں کی طرح اس قسم کا کوئی الزام جماعت پر نہیں لگایا ہے۔ اس لئے ہماری یہ باادب گزارش ہے کہ جب تک وہ جماعت پر کسی نئے عقیدے یا نئے ماخذِ دین کی ایجاد کا الزام نہیں لگا لیتے اس وقت تک جماعت پر ایک فرقہ ہونے کا الزام لگانے میں بھی وہ توقف فرمائیں۔

ایک فرقہ ہونے کا الزام تو درکنار جماعت اسلامی پر ایک الگ فقہی مذہب ہونے کا الزام بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ ایک الگ فقہی مذہب ہونے کے لئے بھی کم از کم پہلی اور بنیادی شرط یہ ہے کہ جماعت یا اس کے امیر نے اجتہاد کے کچھ ایسے اصول ایجاد کئے ہوں جو مذاہب اربعہ کے اصول اجتہاد سے مختلف ہوں لیکن معلوم ہے کہ ہم نے اس طرح کی کوئی بات نہیں کی ہے۔ صاحب تحریر بزرگ نے ہم پر نااہلیت اور غلط فتوے دینے اور غلط اجتہاد کرنے کے الزامات تو لگائے ہیں لیکن یہ الزام نہیں لگایا ہے کہ ہم نے ائمۂ اربعہ کے اصولوں سے کچھ ایک اصول اجتہاد کے ایجاد کر لئے ہیں۔ ایسی صورت میں ہم کو ایک الگ فرقہ قرار دینا تو درکنار وہ ایک الگ فقہی مذہب بھی

قرار دینے کا حق نہیں رکھتے۔

باقی رہی یہ بات کہ جماعت کے لوگوں کو یہ زعم ہے کہ "صحابہؓ کے بعد دین کو بہمہ شعبہ جات کا ئنّہ بس ہم نے سمجھا ہے" یا یہ کہ "ہم اصلی اور تحقیقی مسلمان ہیں دوسرے نسلی اور تقلیدی" تو یہ بات بالکل بہتان ہے۔ جماعت اسلامی اس قسم کی کسی غلط فہمی میں ہرگز مبتلا نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ جماعت سے بدگمانی رکھنے والے حضرات پہلے تو خود اپنے دل میں یہ فرض کرتے ہیں کہ جماعت اسلامی ایسا سمجھتی ہوگی، پھر خود ہی اپنے اس مفروضہ کو واقعہ کی شکل دے لیتے ہیں اور یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ جماعت اسلامی ایسا سمجھتی ہے۔ جماعت اسلامی جو کچھ سمجھتی ہے وہ تو بس اتنا ہے کہ آج پورے دین کو زندگی کے تمام انفرادی، اجتماعی اور سیاسی شعبوں میں قائم کرنے کی عملاً جدوجہد کرنے والی اور اس مقصد کے لئے آگے بڑھ کر لڑنے والی جماعت اُس کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ اور یہ بات بھی جو کہی جاتی ہے تو بطور فخر و غرور کے نہیں کہی جاتی، کیونکہ یہ بات کوئی فخر کی بات بہرحال نہیں ہے، بلکہ بطور اظہارِ حسرت و افسوس کے کہی جاتی ہے کہ دین کی غربت اور حق کی بیکسی کا یہ عالم ہے کہ آج اس سرزمین پر باطل سے باطل مقاصد کے لئے بڑی بڑی پارٹیاں اور جماعتیں موجود ہیں لیکن اسلام ہی ایک ایسا مظلوم ہے جس کو زندگی کے ہر شعبے میں غالب کرنے کا حوصلہ رکھنے والی ایک چھوٹی سی جماعت، جماعت اسلامی کے سوا کوئی اور پارٹی موجود نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جماعت اسلامی کا یہ احساس محض ایک احساس نہیں ہے بلکہ ایک واقعہ ہے جس کا کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن ہمارے یہ بزرگانِ دین چونکہ اس بات میں اپنی تحقیر محسوس کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح بالواسطہ اُن کی دینی خدمات کا انکار کیا جا رہا ہے اس لئے وہ اس کو اس شکل میں تعبیر کرتے ہیں کہ جماعت اسلامی کے لوگ اپنے سوا کسی کو دین کا فہم و شعور رکھنے والا سرے سے سمجھتے ہی نہیں۔

جماعت کے طریقِ تنظیم کو بھی محض سطحی نظر سے دیکھ کر یہ رائے قائم کی جاتی ہے کہ وہ ایک نیا فرقہ بن رہی ہے اور سوادِ اعظم سے کٹ رہی ہے کیونکہ ہر مسلمان کو اپنے دائرے میں نہیں لے لیتی، اور مسلمانوں کے اندر نسلی اور اصلی کا فرق کرتی ہے، اور جماعت کے اندر اور باہر کا امتیاز کرتی ہے۔ لیکن دراصل یہ

ساری باتیں ہمارے نقطۂ نظر کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہیں۔

جماعت اسلامی نے اپنی تنظیم کی بنیاد اس اصول پر رکھی ہے کہ اس کے اندر صرف وہی لوگ شامل ہوسکتے ہیں جو اسلام کو اپنی انفرادی زندگی کا بھی دین مانتے ہوں اور اپنی اجتماعی اور سیاسی زندگی کا بھی۔ نیز وہ اپنی انفرادی زندگی کی حد تک اس پر پوری طرح عمل کرتے ہوں اور اپنی اجتماعی اور سیاسی زندگی میں اس کو جاری کرنے کے لئے جد و جہد کرنے کا عزم رکھتے ہوں۔ مجرد اس بنا پر کہ ایک شخص مسلمان گھرانے کے اندر پیدا ہوا ہے خواہ اسلام کے ساتھ وہ کوئی عملی و اعتقادی وابستگی نہ رکھتا ہو، کوئی شخص اس جماعت میں داخل نہیں ہو سکتا۔

ظاہر ہے کہ آج مسلمانوں کی قوم ہر قسم کے افراد پر مشتمل ہے۔ ان میں کتنے ہیں جو اسلام کے ساتھ اس کے سوا کوئی نسبت نہیں رکھتے کہ وہ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے ہیں۔ نہ وہ اسلام کے کسی حکم پر عمل ہی کرتے ہیں نہ اس کی کسی نہی سے بچتے ہی ہیں۔ کتنے ہیں جو اسلام کو صرف انفرادی زندگی ہی کا دین مانتے ہیں، اپنی اجتماعی زندگی کو شریعت کی پابندیوں سے وہ بالکل آزاد سمجھتے ہیں۔ کتنے ہیں جو اسلام کے اصولوں کے کھلم کھلا منکر ہیں بلکہ اسلام کا مضحکہ اڑانے سے بھی باز نہیں رہتے۔ اب اگر کوئی جماعت اس عزم کے ساتھ اٹھے گی کہ وہ مسلمانوں کے اندر پورے دین کو قائم کرے گی تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے اس مقصد میں اس طرح کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی کہ مذکورۂ بالا تمام قسم کے مسلمانوں کی ایک فوج بھرتی کر لے۔ لامحالہ اسے یہی کرنا پڑے گا کہ وہ پہلے ان مسلمانوں کو چھانٹے جو اعتقاداً بھی مسلمان ہوں اور عملاً بھی، اور جو اسلام کو انفرادی زندگی کا دین بھی مانتے ہوں اور اجتماعی زندگی کا دین بھی۔ پھر وہ انہی کو دوسرے مسلمانوں کی اصلاح اور ان کو اپنی طرف کھینچنے کا ذریعہ بنائے۔ یہی کام جماعت اسلامی نے کیا ہے لیکن اس پر ہمارے یہ بزرگانِ دین برہم ہیں کہ جماعت اسلامی اصلی مسلمان صرف اپنے ارکان ہی کو سمجھتی ہے، باقی سارے مسلمانوں کو صرف نسلی مسلمان قرار دیتی ہے اور جماعت کے اندر اور جماعت کے باہر کے مسلمانوں میں امتیاز کرتی ہے۔

جماعت کے اندر اور جماعت کے باہر کے مسلمانوں میں جماعت اسلامی امتیاز تو بیشک کرتی ہے۔

لیکن انتہائی نادان ہوگا وہ شخص جو یہ سمجھے کہ یہ امتیاز کفر و اسلام کا ہے یا صالح اور غیر صالح کا ہے۔ یہ امتیاز دراصل صرف اس پہلو سے ہے کہ جماعت کے اندر وہ لوگ ہیں جو اصلاح کے کام میں ہمارے ساتھ تعاون کرنے کے لئے تیار ہیں، اور اس مقصد کے لئے وہ خالص اسلامی اصولوں پر ایک جماعتی نظام میں منسلک ہو گئے ہیں جس کی بنا پر کوئی ان کو حکم دے سکتا ہے اور وہ اس کا حکم مان سکتے ہیں۔ باقی رہے جماعت سے باہر کے مسلمان تو وہ ہر قسم کے مسلمانوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں اسلام سے بالکل بے خبر بھی ہیں اور اسلام سے باخبر بھی۔ ان میں صالح بھی ہیں اور فاسق بھی۔ ان میں اسلام کے دشمن بھی ہیں اور اسلام کے دوست بھی۔ اُن میں اسلامی نظام کے چاہنے والے بھی ہیں اور اسلامی نظام کے مخالفین بھی۔ ہم ان کے اندر کے تمام صالحین اور اخیار کو اپنی ہی جماعت کا آدمی سمجھتے ہیں۔ اگرچہ وہ ابھی ہم سے ملے نہیں ہیں لیکن ہم ان کو وَاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ کے حکم میں داخل سمجھتے ہیں اور یہ امید رکھتے ہیں کہ دیر یا سویر ہم ان سے مل جائیں گے یا وہ ہم سے مل کر رہیں گے۔ مقصد اور طریقِ کار کی یکسانی کے باوجود یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم اور وہ زیادہ دنوں تک الگ الگ کرتے رہیں۔ اس وقت ہمارے اور ان کے درمیان جو علیحدگی ہے وہ بیشتر نتیجہ ہے ان کی طرف سے بعض بدگمانیوں کا اور ہماری جانب سے بعض کوتاہیوں کا۔ ہم نے اب یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم اپنی کوتاہیاں دور کر کے رہیں گے وہ اپنی بدگمانیاں دور کریں یا نہ کریں۔ گو توقع ان کی طرف سے بھی ہم کو اچھی ہی ہے۔

(۲) دوسرا الزام جو صاحبِ تحریر بزرگ نے جماعت پر لگایا ہے وہ جہلِ مرکب کا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "جماعت کا ہر شخص یا تو خود اپنے آپ کو اجتہاد کا مستحق سمجھتا ہے یا جماعت کے وابستہ اہلِ علم سے رجوع کرتا ہے" اور جماعت کے پورے حلقے میں ایک عالم بھی ایسا نہیں ہے جس کا علم اور تفقہ تفصیلی مسائل میں لائق اعتماد ہو۔ اس لئے ان کے بڑے بڑے مدعیانِ علم مسائل کے بارے میں فاحش اور مضحکہ انگیز غلطیاں کرتے ہیں...... کتاب و سنت اور فقہائے امت کے استنباطات پر اُن کی نظر بہت کم ہے۔"

میں صاحب تحریر بزرگ اور ان کی طرح لے جماعت سے بے خبر اشخاص کی اطلاع کے لئے اس امر واقعی کا اظہار ضروری خیال کرتا ہوں کہ جماعت کے اندر ہر شخص کا اپنے آپ کو اجتہاد کا مستحق سمجھنا اور اجتہاد کرنا تو الگ رہا جماعت کا ہر شخص اپنے آپ کو تقریر کرنے کا بھی نہ مستحق سمجھتا ہے اور نہ بلا اجازت تقریر کرتا ہی ہے۔ صرف وہی لوگ تقریر کر سکتے ہیں جو اپنی اہلیت کی بنا پر جماعت کے اہلِ حل و عقد کی طرف سے اس کے لئے مجاز قرار دیئے گئے ہوں۔ جو جماعت اپنے ڈسپلن میں اتنی سخت ہو کہ ہر شخص کو تقریر کرنے کی بھی اجازت دینے کی روادار نہ ہو وہ ہر شخص کو اجتہاد کر ڈالنے کی چھوٹ کیسے دے سکتی ہے، درانحالیکہ ایک نا اہل کا اجتہاد ایک نا اہل کی تقریر سے اس کے لئے اور دوسروں کے لئے کہیں زیادہ فتنہ انگیز ہے۔ اگر اس قسم کے کچھ برخود غلط ارکان جماعت کہیں موجود ہوں تو صاحب تحریر بزرگ اور ان کے ہم خیالوں سے ہماری گزارش ہے کہ ان کے ناموں اور ان کے اجتہادات کے کچھ نمونوں سے ہمیں ضرور آگاہ فرمائیں تاکہ ہم جماعت کو ان کی فتنہ انگیزیوں سے محفوظ کر سکیں۔

رہے جماعت کے اہلِ علم تو ان کی نسبت جس رائے عالی کا اظہار کیا گیا ہے وہ مدرسی اور خانقاہی حلقوں سے اکثر ہماری نسبت ظاہر کی جاتی رہی ہے اور ہم نے اس کا جواب دینے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس لئے کہ فی الواقع اس کا ہمارے پاس کوئی جواب تھا ہی نہیں آخر جو لوگ ہمیں یہ کہتے ہیں کہ تم عالم فاضل نہیں ہو تو ہم ان کے جواب میں کیا یہ کہیں کہ نہیں تم جھوٹ کہتے ہو، ہم تو بڑے عالم فاضل ہیں اور ہمارے پاس یہ یہ سندیں اور یہ یہ تصدیقیں ہمارے علم و فضل اور تبحر کی شہادت میں موجود ہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ تو تو میں میں کچھ اچھی چیز نہیں ہے۔ اس لئے ہم اپنے ان بزرگوں کی لن ترانیوں کے جواب میں ہمیشہ خاموش ہی رہے۔ ہم نے خیال کیا کہ زمانہ خود بہترین جج ہے۔ وہ خود اس بات کا فیصلہ کرے گا کہ ہم کیا ہیں اور کیا نہیں ہیں۔ جن لوگوں نے اپنے آپ کو میدان میں اس لئے اتار دیا ہے کہ وہ زمانے سے لڑیں گے اور باطل پر حق کو غالب کر کے رہیں گے یا اس کشمکش میں اپنے آپ کو مٹا دیں گے ان کی قابلیتوں کی شہادت ـــــ

اگر فی الواقع ان کے اندر کوئی قابلیت موجود ہے ـــــ خود زمانہ دے گا۔ ان کے لئے مدعیوں اور خانقاہوں کی تصدیق کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے ہم اس معاملہ کو خدا کے حوالے کر کے کہ وہی تمام علم و فضل کا منبع ہے، چپ ہی رہے اور اب بھی جہاں تک اس جھگڑے کا تعلق ہے ہم چپ ہی رہتے۔ لیکن صاحب تحریر بزرگ نے ہماری بہت سی فاحش اور مضحکہ انگیز غلطیوں کا اجمالی طور پر حوالہ دے کر چھوڑ دیا ہے، بتایا نہیں ہے کہ وہ غلطیاں کیا ہیں، یقیناً یہ غلطیاں بہتوں کے لئے ٹھوکر اور گمراہی کا سبب ہو سکتی ہیں، اس لئے ہم صاحب تحریر بزرگ سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ ان فاحش اور مضحکہ انگیز غلطیوں سے ہمیں ضرور آگاہ فرمائیں تاکہ ہم ان کی اصلاح کر سکیں۔ اور اگر موصوف کو ہم سے کسی اصلاح کی توقع نہ ہو تو پبلک ہی کو ان غلطیوں کی تفصیل سے آگاہ فرما دیں تاکہ لوگ ان سے محفوظ رہ سکیں۔

ایک اور بات کی یہاں تھوڑی سی وضاحت ہو جائے تو اچھا ہے کہ "تفصیلی مسائل" سے ہمارے ان بزرگوں کی کیا مراد ہے جس کے علم و تفقہ میں جماعت کا ایک صاحب علم بھی لائق اعتماد نہیں ہے؟ کیا اس سے مراد اس طرح کے مسائل ہیں کہ اگر کسی کوئیں میں چوہیا مر جائے تو وہ کتنے ڈول پانی نکالنے سے پاک ہوگا؟ اگر یہی مراد ہے تو میں صاحب تحریر بزرگ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ جماعت کے اندر ایسے لوگ موجود ہیں جو اس "تفقہ" میں آپ حضرات سے اگر آگے نہیں تو پیچھے بھی نہیں ہیں۔ اور اگر اس سے مراد وہ مسائل ہیں جو موجودہ زمانے کی روزمرہ زندگی میں نئی تہذیب کے تصادم سے پیش آرہے ہیں تو اس طرح کے مسائل سے تعرض کرنے والی اگر کوئی جماعت آج موجود ہے تو یہی جماعت اسلامی ہی ہے۔ یہ الگ سوال ہے کہ وہ اس کی اہل ہے یا نہیں مگر چونکہ کوئی اور اہل تر جماعت آج اس کام کے لئے آگے نہیں آرہی ہے اس لئے تمدنی، اجتماعی، اور سیاسی مسائل میں جماعت اسلامی نے اسلام کا نقطۂ نظر واضح کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لے رکھی ہے۔ اگر کوئی جماعت ایسی موجود ہے جو ان مسائل میں اپنے علم و تفقہ کو جماعت اسلامی کے علم و تفقہ سے زیادہ لائقِ اعتماد سمجھتی ہے تو بسم اللہ وہ آگے بڑھے، جماعت اسلامی اس کے پیچھے چلے گی۔

نااہلوں کو تو آگے بڑھنے کا موقع دیا ہی اس چیز نے ہے کہ جو اہل تر تھے انھوں نے اپنی ذمہ داریاں محسوس نہیں کیں۔

مولانا مودودی کا علم و مطالعہ مدرسی اور خانقاہی حلقوں میں اکثر زیر بحث رہا ہے اور میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ اس معاملہ میں لوگوں کا غرور علم اکثر اعتراف حق پر غالب آیا ہے۔ میں یہ تو نہیں جانتا کہ مودودی صاحب نے کہاں پڑھا ہے اور کیا پڑھا ہے، لیکن میں اس بات کو اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ نہایت ذہین آدمی ہیں، نہایت قابل آدمی ہیں، اور نہایت وسیع النظر عالم ہیں۔ ان کا مرتبہ صرف اس پہلو ہی سے اونچا نہیں ہے کہ وہ جدید علوم و افکار پر نہایت وسیع نگاہ رکھتے ہیں، اور ایک بلند پایہ انشا پرداز ہیں بلکہ ان کی اصلی خوبی یہ ہے کہ وہ کتاب و سنت پر نہایت گہری اور وسیع نظر رکھتے ہیں۔ قرآن کا انھوں نے ایک اسکالر کی طرح مطالعہ کیا ہے اور برابر اس پر تدبر کرتے رہتے ہیں۔ صرف بیضاوی اور جلالین "بقدرِ نصاب" پڑھ کر مفسر نہیں بن بیٹھے ہیں۔ انھوں نے حدیث کی تمام مستند کتابوں کو حرف حرف نہایت غور و فکر کے ساتھ پڑھا ہے، صرف ان کے "دورہ" پر اکتفا نہیں فرمایا ہے۔ اسی طرح فقہ، اصول، سیرت اور رجال کی تمام ضروری کتابیں ان کی نگاہوں سے گزری ہوئی ہیں۔ ان کے مطالعہ کا طریقہ بھی محققانہ ہے۔ میں ۲۰ ماہ ان کے ساتھ جیل میں رہا ہوں اور میں نے نہایت قریب سے ان کو دیکھا ہے کہ وہ کس طرح کی چیزیں پڑھتے ہیں، کس طرح پڑھتے ہیں اور کس قدر پڑھتے ہیں۔ انھوں نے صرف جیل کے قیام کے دوران میں عام علوم و فنون کے سوا تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت اور رجال کی اتنی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے کہ میں پورے اطمینان کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ جو حضرات ان کے مطالعۂ کتاب و سنت پر باندازِ استخفاف تبصرہ فرماتے ہیں اُن کو شاید مدۃ العمر اتنی کتابیں پڑھنے کی سعادت نہیں حاصل ہوئی ہوگی۔ میں نے جب کبھی ان کی کوئی پڑھی ہوئی کتاب کسی ضرورت کے لئے اٹھائی تو حدیث اور فقہ کی موٹی موٹی کتابوں پر بھی دیکھا ہے کہ ان کے تمام اہم یا قابلِ تنقید مقامات پر حاشیہ میں خود اُن کے قلم سے مفید نوٹ موجود ہیں۔ وہ عربی زبان کو عالمانہ طور پر سمجھتے ہیں، حاطب اللیلی کی

طرح ہوائی تیر تکے نہیں چلاتے۔ جیل کے دورانِ قیام میں مجھے بعض اوقات عربی کی بعض مشکل یا غلط چھپی ہوئی عبارتوں کے بارے میں اُن کے مشوروں سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا ہے اور میں نے ہر مرتبہ یہ محسوس کیا کہ وہ عبارت کا تجزیہ کرنے اور کلام کی نحوی تالیفات سمجھنے میں مدرسی مولویوں سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں۔ پھر کام کو وہ جس ذمہ داری کے ساتھ کرتے ہیں اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کوئی چھوٹی سے چھوٹی تقریر بھی اس وقت تک کرنا پسند نہیں کرتے جب تک اس کے لئے اچھی طرح تیاری نہ کرلیں ——— اگر ایک ایسے شخص پر بھی کتاب و سنت کے علوم کے بارے میں ہم اعتماد نہیں کرسکتے تو پھر میں نہیں سمجھتا کہ کتاب و سنت کے علم کے بارے میں اس ملک میں کس شخص پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔

(۳) صاحبِ تحریر بزرگ نے سب سے زیادہ دردانگیز الفاظ میں جو الزام ہم پر لگایا ہے وہ تصوف کے انکار اور اکابرِ تصوف کی تحقیر کا ہے۔ اس الزام کے پہلے حصے کے متعلق تو یہ گزارش ہے کہ ہم نے تصوف کی مخالفت جس پہلو سے اور جن وجوہ سے کی ہے انھیں مولانا مودودی نے اپنی کتابوں اور مضامین میں نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کردیا ہے اور میں نے بھی اپنے رسالہ "حقیقتِ تقویٰ" میں اس مسئلے پر بحث کی ہے۔ جو شخص چاہے ان رسائل کی مدد سے ہماری مخالفت کی حقیقت اور اس کے اسباب و وجوہ معلوم کرسکتا ہے۔ لیکن یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ہم نے بالواسطہ یا بلاواسطہ اکابرِ تصوف کی کسی نوعیت سے کوئی تحقیر کی ہے۔ وہ تمام اکابرِ صوفیہ جنھوں نے دین کی خدمتیں انجام دی ہیں ہمارے نزدیک بھی اسی طرح محترم ہیں جس طرح صاحبِ تحریر بزرگ کے نزدیک وہ محترم ہیں لیکن اس احترام کے لئے ہم یہ ضروری نہیں سمجھتے کہ ان کو بالکل معصوم بنا کے چھوڑ دیں اور ان کو وہ درجہ دے دیں جو ہمارے دین میں صرف اللہ کے رسول کو دیا گیا ہے۔ اگر کسی شخص کے احترام کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس پر کسی پہلو سے کوئی تنقید ہی نہ کی جائے تو ہم اس کو احترام نہیں سمجھتے بلکہ بت پرستی سمجھتے ہیں اور اس بت پرستی کو مٹانا منجملہ ان مقاصد کے ایک اہم مقصد ہے جن کو جماعت اسلامی اپنے پیشِ نظر رکھتی ہے۔ جو شخص ہمارے لٹریچر کو پڑھتا ہے

بجائے اس کے کہ وہ شاہ ولی اللہ صاحب، مجدد صاحب اور دوسرے بزرگوں سے متنفر ہو، یہ محسوس کرتا ہے کہ ہم اسی کام کو انجام دینا چاہتے ہیں جس کو ان بزرگوں نے انجام دینا چاہا تھا، اور اس کام میں ان بزرگوں کی رہنمائی سے پورا پورا فائدہ بھی اٹھا رہے ہیں، لیکن اس فائدہ اٹھانے میں ہم اُس کسوٹی سے بھی کام لے رہے ہیں جو صحیح اور غلط کے پرکھنے کی واحد کسوٹی ہے اور جس پر جانچے بغیر کسی بڑے سے بڑے بزرگِ دین کی بات کو مان لینا بھی ہمارے دین میں ایک صاحب علم کے لئے حرام ہے۔ اس کسوٹی کا نام ہے کتاب اور سنت۔ ہمارے صاحبِ تحریر بزرگ نے بھی یہ نام بار بار لیا ہے لیکن معلوم نہیں وہ اس کے مصرف سے بھی واقف ہیں یا نہیں؟

تصوف کے متعلق جماعت اسلامی بحیثیت ایک جماعت کے تو کوئی مسلک نہیں رکھتی کیونکہ وہ اس طرح کے مسائل کا فیصلہ کرنے کے لئے نہیں بنی ہے۔ اور مودودی صاحب کا نظریہ اس معاملہ میں بہت نرم ہے، جیسا کہ تجدید و احیاء دین اور رسالۂ دینیات سے معلوم ہوتا ہے۔ مگر میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ میں مروجہ تصوف کو بدعت سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک اس کو اس احسان سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں ہے جو شریعت میں مطلوب اور معتبر ہے۔ احسان کی کوئی اپنی خاص شکل و صورت شریعت سے الگ نہیں ہے۔ اس کی حقیقت تو بس اس قدر ہے کہ آدمی اللہ کی شریعت پر پورے صدقِ دل اور پورے حضورِ قلب کے ساتھ اس کی روح اور حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے عمل کرے۔ دنیا میں انبیاء کی بعثت کا اصلی مقصد لوگوں کا تزکیہ ہے اور وہ اپنے اس اصلی مقصد کو کبھی نا تمام چھوڑ کے نہیں جاتے کہ دوسرے لوگوں کو اس کے اصول و فروع مرتب کرنے پڑیں۔ اگر دوسرے لوگ ایسا کریں تو خلق اور خالق دونوں کے نزدیک ان کی یہ ذمہ داری ہے کہ اپنی ہر بات کے متعلق ثبوت بہم پہنچائیں کہ انھوں نے یہ بات قرآن کی کس آیت سے یا پیغمبر کی کس حدیث سے اخذ کی ہے۔ اس معاملے میں نہ کسی شخص کا مجرّد ذوق معتبر ہے اور نہ کسی شخص کا کشف و حال قابلِ لحاظ ہے۔ اور یہ کہنا تو انتہا درجہ کی ضلالت ہے کہ تزکیہ کے یہ رموز کسی خاص شخص یا چند خاص اشخاص ہی کو معلوم ہو سکے، دوسروں پر پیغمبر صلعم نے ان کو نہیں

کھولا۔ یہ اسلام میں باطنیت کی بنیاد رکھنا ہے اور دینِ اسلام کی روح اس باطنیت کا قلع قمع کرنا چاہتی ہے۔ جو لوگ یہ بات کہتے ہیں وہ خدا کے رسول پر سب سے بڑی تہمت لگاتے ہیں اور ہزار ہا فتنوں کے دروازے کھول رہے ہیں۔

ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے تصوف کی جو مخالفت کی ہے اس کو صاحبِ تحریر بزرگ نے "اعراض" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ حالانکہ انھوں نے صرف اعراض نہیں کیا ہے بلکہ تصوف کی نہایت مدلل مخالفت کی ہے اور صرف اس کی مخالفت ہی نہیں کی ہے بلکہ اس کی جگہ پر کتاب و سنت سے اُس احسان کے اصول بھی مرتب کر دیے ہیں جو اسلام میں معتبر ہے۔ پھر ان کی مخالفت کی نوعیت بھی ایسی نہیں ہے کہ آدمی اس کو معلوم کرنے کے بعد بغیر اس کے بارے میں یکسو ہوئے چین کی نیند سو سکے۔ ہمارے اکابرِ تصوف اور ابنِ تیمیہ کے نقطۂ نظر کے اختلاف کا ایک سرسری اندازہ صرف اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ یہ حضرات شیخ ابن عربی کو شیخ الکل سمجھتے ہیں اور تصوف میں سارا مدارِ سخن انھی پر رکھتے ہیں۔ لیکن ابنِ تیمیہ کے پاس ان کے لئے دجال سے کم کوئی لفظ ہی نہیں ہے۔ ابن تیمیہ سارے تصوف کو بدعت اور ضلالت قرار دیتے ہیں۔ یوں تو انھوں نے تقریباً اپنی ساری ہی کتابوں اور سارے ہی رسائل میں کسی نہ کسی پہلو سے تصوف پر تنقید کی ہے لیکن خاص طور پر ایک شیخِ تصوف کی ایک تصنیف کو انھوں نے تنقید کے لئے انتخاب کیا اور اس پر تنقیدی نوٹ لکھے جن کو بنیاد قرار دے کر ان کے شاگرد علامہ ابن قیم نے مدارج السالکین لکھی جو ایک ضخیم کتاب ہے۔ اس کتاب میں صوفیہ کے تصوف پر ابن قیم نے پوری تفصیل کے ساتھ تنقید کر کے یہ دکھایا ہے کہ کس طرح یہ تصوف قدم قدم پر کتاب و سنت سے منحرف ہے۔ میری نگاہ سے آج تک فنِ تنقید پر اس سے زیادہ عالمانہ اور اس سے زیادہ منصفانہ کتاب کوئی اور نہیں گزری۔ اس کتاب نے ایک طرف تو بدعی تصوف کے بخیے ادھیڑ ڈالے دوسری طرف احسان کے تمام مقامات و مدارج کی کتاب و سنت کے نہایت واضح دلائل کے ساتھ تفصیل کر دی ہے۔ اس کو پڑھ کر ہر شخص معلوم کر سکتا ہے کہ تصوف میں کیا خرابیاں ہیں،

کن پہلوؤں سے اس نے ہمارے تمام معیارات بدل ڈالے ہیں اور کس طرح اس کو صحیح مان لینے کے بعد یہ لازماً ماننا پڑتا ہے کہ العیاذ باللہ انبیا اور صحابہ تقویٰ اور تزکیہ کے لحاظ سے معیاری لوگ نہیں تھے۔ ابن قیم نے تمام مقامات کی تشریح کرکے یہ دکھایا ہے کہ ان حضرات نے اپنا منتہا کتاب و سنت کے مقرر کیے ہوئے منتہا سے ہر میدان میں آگے مقرر کیا ہے جس کے سبب سے ایک طرف وہ کتاب و سنت نگاہوں سے گرتے ہیں اور دوسری طرف امت میں رہبانیت کی بیماری پھیلتی ہے۔ کیونکہ ہر معاملے میں صحیح فطری اور عملی حد وہی ہو سکتی ہے جو شریعت نے مقرر کر دی ہے۔ اگر کوئی شخص اس حد سے آگے بڑھنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے گا تو وہ لازماً اپنی فطرت سے جنگ کرے گا اور رہبانیت کے دروازے کھولے گا۔

جن لوگوں نے اتنی وضاحت کے ساتھ اپنا موقف بیان کر دیا ہے اور صرف اپنے ہی لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے بھی یہی راہ کھولی ہے ان کو ہمارے صاحب تحریر بزرگ صرف "اعراض" کرنے والا قرار دیتے ہیں۔ میں صاحب تحریر بزرگ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ مدارج السالکین پڑھیں۔ اس سے انھیں ایک حد تک اندازہ ہو سکے گا کہ تصوف کے متعلق جو رائے ظاہر کر رہا ہوں وہ محض خیرہ سری اور بدذاتی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ارباب تصوف کا پورا احترام ملحوظ رکھنے کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ تصوف اور احسان دو بالکل مختلف چیزیں ہیں۔ ان کو جن لوگوں نے بھی ایک سمجھا انھوں نے غلطی کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان میں سے اکثر کی نیتیں نیک ہوں۔

ان واجب الاحترام بزرگوں کی غلطیاں گنانا کوئی خوشگوار کام نہیں ہے[1] لیکن اپنے مدعا کو واضح کرنے کے لیے ایک آدھ مثال کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ میں صاحب تحریر بزرگ ہی کی تحریر سے ایک مثال تصوف کی خوفناک بدعتوں کی پیش کرتا ہوں۔ ہمارے صاحب تحریر بزرگ ارشاد فرماتے ہیں:-

نقشبندیہ اور خصوصاً مجدد سرہندیؒ نے تصور شیخ تک کو استعمال کرایا جو بجد خطرناک

[1] شاید یہ نرمی اس لئے ہے کہ ان بزرگوں کی وفات پر چند صدیاں گزر چکی ہیں اور غصہ کے اصل مستحق معاصرین ہوا کرتے ہیں۔

اور محدود تر طریقہ ہے۔ محض اس لئے کہ جانتے تھے کہ لوگ عموماً خوگرِ پیکرِ محسوس ہیں۔ صورتِ محسوس کے بغیر مجرد معنی تک وصول کی صلاحیت ہی نہیں۔ محسوس پرستی کا ذوق اس قدر مسلط ہے اور تجرید و تفرید معانی سے اس قدر عاری ہیں کہ بغیر اس کے خدا کا تصور و تمکن قلوب میں ہوتا ہی نہیں۔ سالہا سال کی اصنام پرستی، صورت پسندی اور اجْعَلْ لَنَا اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ اور لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً کی بدذوقی نے تنزیہی الوہیت، بے شبہ و مثال، بے کیف و لون، بے جہت و قیاس خدا کا تصور دشوار تر کر دیا، اور وصول ہے ضروری، لہذا ہوائی سفر کے بجائے اگر چھکڑے ہی کے ذریعے قطع مسافت ممکن ہو تو یوں ہی سہی مقصد تو وصول ہے۔"

اس عبارت کو پڑھ کر حضرت مجدد سرہندی، حضرات نقشبندیہ اور صاحبِ تحریر بزرگ کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے، چند باتیں پوچھنے کو جی چاہتا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر اس دلیل کی بنا پر کہ لوگ پیکر محسوس کے خوگر ہیں اور بغیر کسی پیکرِ محسوس کے ایک بے جہت و بے قیاس خدا کا تصور نہیں کر سکتے، ان کو تصور شیخ کا طریقہ استعمال کرایا جا سکتا ہے، تو آخر ہندوؤں کی بت پرستی اور مظاہر پرستی میں کیا قباحت ہے؟ ان کے فلسفی بھی تو یہی کہتے ہیں کہ لوگ ایک مجرد حقیقت کا تصور نہیں کر سکتے اس لیے ناگزیر ہے کہ ان کو اس کا تصور محسوس مظاہر کی شکل میں کرایا جائے، مقصود تو حقیقتِ مجرد تک پہنچنا ہے، لہذا ہوائی جہاز کے ذریعے اگر سفر نہیں ہو سکتا تو چھکڑے ہی کے ذریعے ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے! ہندوستان کے ہندو ہی نہیں بلکہ عرب کے بت پرست بھی بتوں کی پوجا کچھ اس لیے نہیں کرتے تھے کہ ان کو خداوندِ عالم سمجھتے تھے بلکہ ان کو وہ خدا تک پہنچنے کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ ان کی بُت پرستی تو شرک قرار پائے اور آپ کا تصورِ شیخ توحید؟ ——— یہی باتیں ہیں جن کے سبب سے بہت سے لوگ تصوف کو برہمنوں کے جوگ سے ماخوذ بتاتے ہیں اور ہمارے صاحبِ تحریر بزرگ کی مذکورہ بالا تقریر سے ان کے خیال کی پوری پوری تائید ہو رہی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ انسانوں کی فطرت اور اس فطرت کے تقاضوں، اس کی بیماریوں اور اس کے علاج کو اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیاء بہتر جانتے ہیں یا مجدد صاحب اور حضرات نقشبندیہ؟ اگر اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیاء بہتر جانتے ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے کہ مجدد صاحب اور حضرات نقشبندیہ نے اس سلسلے میں جو طریقہ اختیار فرمایا وہ صریحاً اللہ تعالیٰ اور اس کے نبیوں کے اختیار کیے ہوئے طریقے سے مختلف ہے؟ بنی اسرائیل نے جب حضرت موسیٰؑ سے مطالبہ کیا کہ اِجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ (ہمارے لئے بھی اس قسم کا معبود بنا دے جس قسم کے معبود ان بت پرست قوموں کے پاس ہیں) تو یقیناً انھوں نے یہ مطالبہ اسی وجہ سے کیا تھا کہ وہ صورتِ محسوس کے بغیر مجرد معنی تک وصول کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ لیکن اس کے جواب میں حضرت موسیٰ نے بجائے اس کے کہ ایک بت گھڑ کے ان کے سامنے رکھ دیتے، یا ان کو تصورِ شیخ کا نسخہ استعمال کرا دیتے، فرمایا کہ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا (بدبختو، کیا میں خدا کے سوا تمہارے واسطے کوئی اور معبود لاؤں) انھوں نے اس کا ذرا لحاظ نہ کیا کہ یہ بیچارے خوگرِ پیکرِ محسوس ہیں اور ابھی ابھی مصر کے بت پرستانہ ماحول سے نکلے ہیں اس لئے ایک بے شبہ و بے مثال خدا کا تصور نہیں کر سکتے، اور مستحق ہیں کہ ان کو ایک بچھڑا بنا کر دیدیا جائے، مقصود تو پہنچنا ہے، خواہ بذریعۂ صنم ہی تک سہی۔

نہ صرف یہ کہ انھوں نے ان کو کوئی بت بنا کر دیا نہیں بلکہ ان کی عدم موجودگی میں جب بنی اسرائیل نے از خود ایک بچھڑا بنا لیا تو انھوں نے طور سے واپسی پر اس کو بھی ریزہ ریزہ کر کے سمندر میں پھنکوا دیا اور ان تمام لوگوں کو جو اس بت کے بنانے میں شریک رہے انھی کے بھائی بندوں کے ہاتھوں قتل کرا دیا اور ذرا اس بات کا خیال نہ کیا کہ یہ بیچارے خوگرِ پیکرِ محسوس تھے، ان کو ہوائی جہاز میسر نہیں آیا تھا اس لئے چھکڑے ہی پر سوار ہو لئے تھے۔

اسی طرح بنی اسرائیل نے جب یہ کہا کہ لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً (ہم تمہاری بات اس وقت تک نہیں ماننے کے جب تک اللہ کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں) تو اس وقت بھی انھوں نے اپنی اسی کمزوری کا اظہار کیا تھا جس کمزوری کے مداوا کے لیے حضرات نقشبندیہ نے

تصورِ شیخ کا نسخہ تجویز فرمایا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی اس کمزوری کا لحاظ فرمانے کے بجائے پہلے تو ان کو ڈانٹا کہ تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے، تمہاری رسائی میری صفات کے مشاہدہ سے آگے نہیں ہے۔ لیکن اس کے بعد بھی جب وہ اپنی ضد پر مصر ہی رہے تو بجائے اس کے کہ ان کی کمزوری پر رحم کرکے ان کو تصورِ شیخ کا نسخہ استعمال کرا دیا جاتا ان کو خدا کی طرف سے ایک کڑک نے آ دبوچا۔

پیکرِ محسوس کے خوگروں کے لئے خدا اور اس کے نبی کا اختیار کیا ہوا طریقہ اور علاج تو یہ ہے جو بیان ہوا لیکن مجدد صاحب اور حضرات نقشبندیہ کا طریقۂ علاج، صاحب تحریر بزرگ کے بقول، اس سے بالکل مختلف ہے۔ انھوں نے اس خیال سے کہ لوگ حقیقت مجردہ کا تصور نہیں کر سکتے ان کو تصورِ شیخ کا رستہ دکھا دیا۔ اب بتائیے کہ ایک مسلمان جو خدا اور اس کے نبیوں پر ایمان رکھتا ہے ان میں سے کس کے طریقے کو اپنے لئے پسند کرے؟ اللہ اور اس کے رسول کے طریقے کو یا مجدد صاحب اور حضراتِ نقشبندیہ کے طریقے کو؟

تیسری گزارش یہ ہے کہ صاحب تحریر بزرگ فرماتے ہیں کہ "ہوائی سفر کے بجائے چھکڑے ہی کے ذریعے اگر قطعِ مسافت ممکن ہو تو یوں ہی سہی مقصود تو وصول ہے۔" اس میں شبہ نہیں کہ اگر موٹر میسر نہ آئے تو چھکڑے پر بھی سفر کیا جا سکتا ہے بلکہ پیدل بھی چلا جا سکتا ہے۔ لیکن سوال "وصول" کے متعلق ہے کہ آپ پہنچنا کہاں چاہتے ہیں؟ خدا تک یا کہیں اور؟ اگر خدا تک پہنچنا پیش نظر ہے تو لامحالہ آپ کو وہاں تک پہنچنے کے لئے وہی طریقے اختیار کرنے ہوں گے جو خدا نے اپنے تک پہنچنے کے لئے بتائے ہیں۔ اس طریقے کے سوا کوئی اور طریقہ اختیار کرکے آپ خدا تک نہیں پہنچ سکتے۔ اگر تصورِ شیخ خدا تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ ہے اور کتاب و سنت سے اس کا کوئی ثبوت ملتا ہے تو اس سے بحث نہیں کہ یہ چھکڑا ہے یا موٹر، آپ شوق سے اس پر سوار ہو جائیے ہم آپ کو ہرگز نہیں روکتے۔ لیکن اگر یہ کوئی ذریعہ سرے سے ہے ہی نہیں، یا خدا تک پہنچانے کے بجائے خدا سے پھیرنے والا ذریعہ ہے تو اس کو اختیار کرکے آپ خدا تک نہیں پہنچیں گے بلکہ ہلاکت کے کسی گڑھے میں جا گریں گے۔ ہاں اگر مقصود بس کہیں نہ کہیں پہنچ جانا ہے، کوئی منزل معین نہیں ہے۔

تو ہمیں ایسے جادہ پیماؤں سے بحث نہیں ہے، وہ جس وادی میں چاہیں بھٹکتے پھریں۔

بہرحال ہم جو تصوف کو بدعت کہتے ہیں وہ ارباب تصوف کی اس قسم کی کتاب وسنت سے ہٹی ہوئی باتوں ہی کی بنا پر کہتے ہیں۔

صاحب تحریر بزرگ نے تصوف کی حمایت میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت بھی نقل کی ہے لیکن امام غزالی کی شہادت ان لوگوں کو کیا مطمئن کر سکتی ہے جو ہر معاملہ میں کتاب وسنت کی دلیل ڈھونڈتے ہوں۔ امام غزالی کے متعلق یہ نقل کیا گیا ہے کہ انھوں نے نبوت کی حقیقت اور خاصیت صوفیوں کے طریقوں سے سمجھی ہے۔ ممکن ہے یہ بات صحیح ہو لیکن انھوں نے نبوت کی حقیقت کیا سمجھی ہے یہ سوال بجائے خود بڑا اہم ہے۔ امام غزالی کی تصنیفوں سے جو حضرات اچھی طرح واقف نہیں ہیں، محض ان کے نام ہی سے مرعوب ہیں، وہ ان کو جو چاہیں بنا کے رکھ دیں لیکن جن لوگوں نے ان کی تصنیفات اچھی طرح پڑھی ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ فلسفۂ یونان کے چکر سے آخر تک پوری طرح نہ نکل سکے۔ انھوں نے اپنی کتابوں میں فلسفۂ یونان کی جتنی تردید کی ہے اس سے زیادہ فلسفۂ یونان کے غلط نظریات کو دین کی سند دی ہے۔ صاحب تحریر بزرگ نے امام صاحب کے جن رسائل کا حوالہ دیا ہے وہ اگر پسند فرمائیں تو میں انھی رسائل سے متعدد باتیں ایسی نکال دے سکتا ہوں جو امام غزالی نے فلسفۂ یونان سے لی ہیں قرآن اور حدیث سے ہرگز نہیں لی ہیں۔ سرسید مرحوم نے بیشتر امام غزالی ہی کی کتابوں کو اپنے مجددانہ نظریات کی بنیاد رکھی ہے اور ان نظریات ہی کی بنا پر مولوی حضرات نے ان کو برا بھلا کہا ہے۔ خود نبوت کے مسئلے پر مجھے امام صاحب کی رائے سے شدید اختلاف ہے اور میں ان کی اس رائے کو فلسفۂ یونان سے مرعوبیت کا نتیجہ سمجھتا ہوں۔ علامہ ابن تیمیہ کی رائے تو ان کے متعلق یہ ہے کہ دخل فی بطن الفلسفۃ فلم یخرج منہا (وہ فلسفہ کے پیٹ میں گھسے اور پھر اس سے نکلنا نصیب نہ ہوا)۔ اسلامی نقطۂ نظر سے ان کی مفید ترین کتاب "احیاء العلوم" ہے۔ بالخصوص محبت الٰہی وغیرہ موضوعات پر اس کی جو بحثیں ہیں وہ نہایت بیش قیمت ہیں لیکن اس

میں بھی صوفیانہ طرزِ فکر کی وہ ساری خرابیاں موجود ہیں جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔

(۴) چوتھا بڑا الزام مودودی صاحب اور جماعت اسلامی پر یہ لگایا گیا ہے کہ یہ لوگ دین کو حال یا ماضی کے اشخاص سے سمجھنے کے بجائے براہِ راست کتاب و سنت سے سمجھنے کے مدعی ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ ہم لوگ ہمیشہ دین کو کتاب و سنت ہی کے ذریعے سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب جیسا کہ صاحب تحریر بزرگ نے سمجھا ہے، ہرگز نہیں ہے کہ ہم تمام فقہا و محدثین اور ان کی تمام فقہی اور دینی خدمات سے بالکل مستغنی ہو گئے ہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ماضی یا حال کے رجالِ دین کی چیزیں جب پڑھتے ہیں تو صرف انہی کی آنکھوں سے نہیں دیکھتے بلکہ اپنی آنکھیں بھی کھلی رکھتے ہیں اور ان کی ہر بات کو جانچنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جو بات وہ کہہ رہے ہیں اس کے لیے ان کے پاس کیا دلیل ہے اور اس دلیل کا کیا وزن ہے؟ یہ ہم اس لیے کرتے ہیں کہ ایسا کرنا عقیدۂ توحید کا لازمی تقاضا ہے۔ ایسا نہ کرنے ہی سے دنیا میں آبا پرستی کی بنیاد پڑی ہے اور خدا کے بندوں کا خدا کی شریعت سے رشتہ ٹوٹا ہے۔ اس بات کی تاکید ہمیں جس طرح قرآن و حدیث میں کی گئی ہے اسی طرح اس کی تاکید خود ان بزرگ ائمۂ دین نے بھی کی ہے جن کی اندھی تقلید پر جینا اور مرنا آج نجات کے لیے ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے واضح ہدایات امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی ہیں انھوں نے مختلف الفاظ میں بار بار اس حقیقت کا اظہار فرمایا ہے کہ جو شخص یہ نہ جانے کہ فلاں بات ہم نے کتاب و سنت کی کس دلیل کی بنا پر کہی ہے وہ ہماری اس بات کی بنا پر فتویٰ نہ دے۔

باقی رہی یہ بات کہ ہم اجتہاد کرتے ہیں تو اس کی نسبت بھی نہایت واضح الفاظ میں یہ ظاہر کر دینا میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم اپنی مادی زندگی کے باقی رکھنے کے لیے جتنا ضروری ہوا اور پانی کو سمجھتے ہیں اس سے کہیں زیادہ ضروری اپنی روحانی زندگی کے لیے ہم اجتہاد کو سمجھتے ہیں۔ اس معاملے میں ہماری ضرورتیں دوسروں کی ضرورتوں سے بالکل مختلف ہیں۔ دوسروں کا دین ان کی زندگی کے ایک نہایت ہی محدود حصے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے چند

لگے بندھے ضابطے ہیں اور وہ اس محدود دائرے کے اندر، اگر ان کا جی چاہتا ہے، اس کی پیروی کر لیتے ہیں۔ زندگی کے باقی گوشوں میں ان کو اس سے بحث نہیں کہ وہ کس کی پیروی کرتے ہیں، خدا کی یا شیطان کی۔ لیکن ہمارا دین ہماری زندگی کے ہر گوشے پر حاوی ہے۔ وہ ہماری انفرادی زندگی کا بھی دین ہے اور ہماری اجتماعی زندگی کا بھی دین ہے۔ اور ہم اپنی زندگی کے کسی گوشے میں بھی اس سے بالارادہ انحراف کو کفر و فسق سمجھتے ہیں۔ اس وجہ سے ہمارے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ ہمارے سامنے جتنے معاملات بھی آئیں ہم ان پر غور کر کے یہ دیکھیں کہ ان کے بارے میں ہمارے دین کی رہنمائی کیا ہے۔ کچھ معاملات ایسے ہوتے ہیں جن کے بارے میں ہمیں کتاب و سنت میں نہایت واضح احکام مل جاتے ہیں، چنانچہ ہم ان پر عمل کرتے ہیں۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے بارے میں ہمیں کتاب و سنت میں کوئی واضح ہدایت نہیں ملتی تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ائمۂ سلف نے اس کے بارے میں کیا اجتہادات فرمائے ہیں۔ ان کے اجتہادات میں سے جس کے قول کو کتاب و سنت سے سب سے زیادہ لگتا ہوا پاتے ہیں اس کو اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اگر معاملہ ایسا ہے جو ائمہ کے زمانے میں پیش نہیں آیا ہے یا اس کے بارے میں ان کی رائیں ہم تک نہیں پہنچی ہیں تو ہم خود اس پر غور کرتے ہیں کہ کتاب و سنت سے لگتی ہوئی بات اس کے بارے میں کیا ہو سکتی ہے اور جس طرف ہماری تحقیق ہم کو لے جاتی ہے ہم اس کو عمل کے لئے اختیار کر لیتے ہیں۔ ہماری تحقیق غلط بھی ہو سکتی ہے اور صحیح بھی۔ لیکن ہم دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ سے اجر کے امیدوار ہیں اس لئے کہ ہماری ذمہ داری صرف اسی قدر ہے کہ جن امور کے بارے میں خدا اور اس کے رسول کی کوئی واضح ہدایت نہ موجود ہو اور نہ ان کے بارے میں ہم سے بہتر لوگوں کے اجتہاد نے ہی کوئی رہنمائی کی ہو ان کے بارے میں ہم اپنی استعداد و استطاعت کی حد تک خدا کی مرضی سے اوفق بات معلوم کرنے کی کوشش کریں اور جس بات پر ہمارا دل ٹھک جائے کہ یہ بات خدا کی شریعت سے اوفق ہے اس کو اختیار کر لیں۔ ہم خلوصِ نیت کے ساتھ جو بات اختیار کر لیں گے وہی بات ہمارے لئے موجبِ اجر بن جائے گی خواہ

وہ فی الحقیقت غلط ہو یا صحیح۔ ہم اس بات کو کسی حالت میں جائز نہیں سمجھتے کہ جس بارے میں ہمیں خدا اور رسول کی کوئی واضح ہدایت نہ ملے تو ہم شریعت سے اوفق کی جستجو کئے بغیر باطل ہی کی پیروی کر ڈالیں، یا اگر اہل تر حضرات مسجد میں نماز پڑھانے کے لئے آنا چھوڑ دیں تو ہم بھی نماز پڑھانے سے انکار کر دیں۔ ہم ایسی خاکساری کے قائل نہیں ہیں جو ادائے فرائض میں مانع ہو۔

اب صرف دو باتیں اس سلسلے میں قابلِ غور رہ جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ کیا ہم نے کوئی اجتہاد ایسا کیا ہے جو ائمہ اربعہ یا ان کے اکابر متبعین کے اجتہاد کے خلاف ہے اور ہم نے ان سب کو چھوڑ کر اپنی کوئی الگ راہ نکالی ہے؟ دوسری یہ کہ کیا ہم نے اپنے سے بہتر اہل علم کو نظر انداز کر کے خود مسندِ اجتہاد سنبھال لینے کی کوشش کی ہے؟ میں ان دونوں باتوں کو بھی یہاں صاف کر دینا چاہتا ہوں۔

اگرچہ اس بات کی کوئی دلیل حصر موجود نہیں ہے کہ فقہ کو ائمہ اربعہ ہی کے اندر دائر و سائر رکھنا چاہیے اور اس دائرے سے الگ ہو کر دین میں کسی اجتہاد کے لئے گنجائش نہیں ہے۔ شاہ صاحب کے جس قول کا صاحب تحریر بزرگ نے حوالہ دیا ہے وہ بھی محض ان کا ذوق ہے، اس کی کوئی شرعی یا عقلی دلیل انھوں نے نہیں دی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مولانا مودودی صاحب کا مسلک اس بارے میں وہی ہے جو صاحب تحریر بزرگ نے شاہ صاحب کا بیان فرمایا ہے۔ وہ ائمہ اربعہ کے مذاہب میں سے کسی ایک مذہب کو بربنائے دلائل ترجیح تو دیتے ہیں لیکن اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ ان کے اجتہادات کو نظر انداز کر کے کوئی اجتہاد کیا جائے۔ میں نے یہ بات متعدد بار ان کی تقریروں میں سنی ہے۔ اس وقت یہ نہیں عرض کر سکتا کہ انھوں نے یہ بات کہیں لکھی بھی ہے یا نہیں۔ بہرحال وہ صاحب علم کے لئے کسی ایک فقہ کے تقلید کو تو صحیح نہیں سمجھتے لیکن مذاہبِ اربعہ کے تقلید کو جہاں تک میں سمجھتا ہوں بہت ضروری خیال کرتے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ اصولاً ہر مذہب کے صرف ان متقدمین کو لائق اعتنا سمجھتے ہیں جو خود مجتہد تھے اور ان متاخرین کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے جو لوگوں کے نرے مقلد تھے۔ مجھے ان سے

کسی ایسے اجتہاد کا پتہ نہیں جس میں انھوں نے ائمۂ اربعہ کو چھوڑ کر تفرد اختیار کیا ہو۔ اگر صاحبِ تحریر بزرگ اُن کے کسی ایسے اجتہاد سے واقف ہوں تو اس سے ضرور آگاہ فرمائیں۔

رہی دوسری بات کہ ہم نے اپنے سے بہتر اہلِ علم کو نظر انداز کیا ہے تو یہ بات بھی صحیح نہیں ہے۔ اول تو اس ملک میں ایسے اہلِ علم ہیں ہی کتنے جو اجتماعی اور سیاسی مسائل میں دین کا نقطۂ نظر سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اور اگر کچھ لوگ ایسے ہیں بھی تو ابھی وہ ہم سے اس بات پر لڑ رہے ہیں کہ دین کا اجتماعی اور سیاسی زندگی سے کوئی علاقہ ہے بھی یا نہیں؟ حد یہ ہے کہ ہمارے ملک کے مغرب زدہ لیڈروں تک نے یہ تسلیم کر لیا کہ ہمارا دین جس طرح ہماری انفرادی زندگی سے تعلق رکھتا ہے اس طرح ہماری سیاسی زندگی سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ لیکن ابھی ہمارے بزرگانِ دین کے دل کی کھٹک پوری طرح نہیں نکلی ہے۔ ایسی صورت میں جبکہ ہمارے اور ان کے درمیان اصل مسئلہ ہی مابہ النزاع ہے اور اس پر وہ ہم سے لڑ رہے ہیں کہ دین کو ان چیزوں سے کوئی تعلق بھی ہے یا نہیں جن چیزوں سے ہم اس کا تعلق جوڑ رہے ہیں تو ہمارے لئے یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم ان کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ عرض کر سکیں کہ ہمارے سامنے یہ یہ مشکلات ہیں، ان میں ہماری رہنمائی فرمائیے۔ اس لئے مجبوراً ہمیں اپنا کام خود ہی سنبھالنا پڑا ہے لیکن ہم یقین دلاتے ہیں کہ جس دن ہم یہ محسوس کر لیں گے کہ ہمارے اور ان کے نقطۂ نظر میں کوئی بنیادی فرق باقی نہیں رہا ہے تو ہم سے زیادہ کسی کو اس بات میں خوشی نہیں ہوگی کہ ہم ان کی رہنمائی سے مستفید ہوں۔

ہم نے (؟) اجتہاد کے کام کو کوئی فخر اور لذت کا کام کبھی نہیں سمجھا ہے۔ اور نہ کبھی اُس دائرے کے اندر ہم نے کوئی اجتہاد کیا ہے جس دائرے کے اندر ہم سے بہتر لوگ اس فرض کو انجام دے چکے ہیں۔ ہم نے اس کام کو ایک ناگزیر دینی ضرورت کی حیثیت سے انجام دیا ہے اور صرف اس حد تک اس کی ذمہ داری اٹھائی ہے جس حد تک شریعت کے ساتھ اپنی زندگی کا ربط قائم رکھنے کے لئے ہم اس کے محتاج تھے۔

(۵) ایک الزام صاحبِ تحریر بزرگ نے تنقید میں بے اعتدالی کا بھی لگایا ہے۔ موصوف کا خیال ہے کہ مولانا مودودی اور ان کے ساتھیوں کو تنقید کا چسکا پڑ گیا ہے اور وہ اس کام کو محض لذتِ نفس کے لئے کرتے ہیں اور چونکہ لذتِ نفس کے لئے کرتے ہیں اس لئے لازمی طور پہ اس میں غیر معتدل بھی ہو گئے ہیں۔

یہ بات واقعہ کے بالکل خلاف ہے۔ لذتِ نفس اور تسکینِ ذوق کے لئے اس زمانے میں مشاغل کی کمی نہیں ہے کہ ہم اس کے لئے یہ راہ ڈھونڈتے۔ ہمارا کوئی کام بھی محض ایک مشغلہ کے طور پہ نہیں ہوتا۔ اور نہ ہم کبھی مضمون نگاری محض مضمون نگاری کی خاطر کرتے ہیں۔ ہماری تمام تحریری اور تقریری سرگرمیوں کا محور وہ دعوت ہے جو ہم اقامتِ دین کے لئے دے رہے ہیں۔ جب تک کسی چیز کا اس سے بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی تعلق نہ ہو وہ ہمارے ہاں زیرِ بحث نہیں آتی۔ اور تنقید کے لئے تو ہم کبھی اس وقت تک قلم اٹھاتے ہی نہیں جب تک کسی چیز کی نسبت ہم یہ محسوس کرلیں کہ یہ چیز دعوتِ دین کی راہ میں مزاحم ہو رہی ہے۔ تصوف پر ہمارے ہاں جو کچھ بھی لکھا گیا ہے اسی پہلو سے لکھا گیا ہے۔ ہم نے خود پیش قدمی کر کے کبھی اس سے تعرض کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ ہمارے سامنے بار بار یہ بات بڑے اصرار کے ساتھ لائی گئی کہ اصلاح و تزکیہ اور تجدید دین کا اصلی راستہ وہ ہے جو اربابِ تصوف نے اختیار فرمایا۔ ہم نے ایمانداری کے ساتھ اس رائے کو غلط سمجھا اس لئے ہم نے اپنا یہ فرض جانا کہ جو کچھ ہمارے نزدیک صحیح ہے ہم اس کو بیان کر دیں تاکہ ہمارا موقف لوگوں کے سامنے اچھی طرح واضح ہو جائے۔ اب اگر آپ حضرات یہ فرماتے ہیں کہ "یہ احوال و کوائف اور اسرار و مواجید ہیں جن پر تنقید کی ضرورت اور نہ رائے زنی کی حاجت" یا "عشاق کے یہ صحیفے صرف لپیٹ کر رکھ دینے کی چیزیں ہیں نہ انکار می کنم و ایں کار می کنم کا معاملہ ان کے ساتھ مناسب ہے" یا "یہ خلوت کے انفرادی احوال جلوت کے اسٹیج پر افشا کے لئے نہیں ہوتے" تو کس نے آپ حضرات سے یہ کہا تھا کہ یہ خلوت کے اسرار جلوت کے اسٹیج پر بیان فرمائیے اور عشاق کے ان صحیفوں کی منظرِ عام پر نمائش کیجئے؟ یقیناً

اس پردہ دری کے مجرم ہم نہیں ہیں بلکہ آپ ہی حضرات ہیں۔ جب آپ ان کو منظرِ عام پر لا چکے تو یہ کہنے کے کیا معنی کہ ان کو صرف وہی پڑھیں جو جوہر شناس ہیں اس لئے کہ ان کے اندر اسرار بند ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کہنے کے معنی اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں کہ جن کی توجہ ان کی طرف نہ بھی ہونے والی ہو وہ بھی اس نقاب کو الٹنے کے مشتاق اور آرزومند ہو جائیں۔

جب آپ ایک کتاب لکھتے ہیں اور پریس اس کو چھاپ بھی دیتا ہے تو اس کو اہل اور نا اہل بھی پڑھیں گے۔ آپ کے اس کہہ دینے کی وجہ سے کہ نا اہل اس کو نہ پڑھیں یہ نہیں ہوگا کہ نا اہل لوگ اپنی نا اہلیت کو ٹھیک ٹھیک جان کر اس کو ہاتھ لگانے سے انکار کر دیں گے بلکہ انسانی فطرت کچھ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ اس ممانعت کے بعد نا اہلوں میں اس کی مانگ اور بڑھ جائے گی اور پریس بھی اس کے چھاپنے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت کرنے کی کوشش کرے گا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں اگر اس کتاب کے سبب سے لوگوں میں کوئی فتنہ پھیلے گا تو اس کی ذمہ داری سے وہ لوگ عنداللہ بری نہیں ہو سکتے جو ایسی "پُر اسرار" کتابوں کے شائع کرنے والے بنے۔ پھر انھوں نے یہ غضب بھی کیا کہ لوگوں کے ذوقِ جستجو کو شہ دینے کے لئے ان کتابوں پر یہ کتبہ بھی لگا دیا کہ ان کو صرف وہی پڑھیں جو اہل ہیں۔ اور اہل بھی کیسے، معمولی اہل نہیں، کیونکہ ان کتابوں کے اسرار اور رموز سمجھنے کے لئے مودودی صاحب اور ان کے رفقاء تو درکنار ابنِ تیمیہ اور ابنِ قیم جیسے لوگ بھی ان حضرات کے نزدیک نا اہل ہی سمجھے جاتے ہیں اور ان کی نسبت بڑے طنطنہ کے ساتھ یہ کہا جاتا ہے کہ "ارباب ظاہر اور اصحاب صحوِ محض ان باتوں کو کیا جانیں۔"

اس علمِ باطن کے ثبوت میں صاحب تحریر بزرگ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کے اقوال کے اجمالاً حوالے دئیے ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے کس قول کی طرف موصوف نے اشارہ فرمایا ہے، اس کے اصل الفاظ کیا ہیں اور سند کے اعتبار سے اس کا حال کیا ہے؟ البتہ حضرت ابوہریرہؓ کے جس قول کا موصوف نے حوالہ دیا ہے اس کی

گزریں گی، بہت سے لوگوں کے ایمان تک متزلزل ہو جائیں گے۔ آخر حضرت عثمان اور حضرت علی کے زمانے کی تاریخ اور بعد کے فتنوں کے حالات آپ کہاں لے جا کر دفن کریں گے کہ کسی کی ان پر نظر نہ پڑنے پائے؟

مودودی صاحب سے صاحب تحریر بزرگ کو یہ بھی شکایت ہے کہ انھوں نے امام غزالی کو حدیث میں کمزور ٹھیرایا ہے اور امام مہدی کی علامات کے سلسلہ میں جو احادیث وارد ہیں ان کا انکار کیا ہے۔

میں صاحبِ تحریر بزرگ کو مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ ان دونوں جرموں میں سے کسی جرم میں بھی مودودی صاحب منفرد نہیں ہیں۔ ناقدینِ حدیث نے خود ہی ان دونوں جرموں میں پہل کر کے دوسروں کے لئے راہ کھول دی ہے۔ امام غزالی نے احیاء العلوم میں بکثرت کمزور حدیثیں نقل کی ہیں جن کی ناقدین حدیث نے نشان دہی کی ہے۔ اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو امام صاحب نے عام صوفیہ کے طریقے پر پند و موعظت کے سلسلے کی حدیثوں میں محدثانہ چھان بین کو ضروری ہی نہ خیال کیا ہو یا یہ بات ہو کہ فلسفہ و تصوف کی دلچسپیوں نے ان کو حدیث کی تحقیق و تنقید کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہ دیا ہو۔ بہرحال احیاء العلوم میں بکثرت کمزور حدیثیں موجود ہیں اور اس معاملے میں ذوق کا سوال پیدا نہیں ہوتا بلکہ نقدِ حدیث کے لگے بندھے اصول ہیں۔ اگر صاحبِ تحریر بزرگ ان اصولوں سے واقف ہیں تو خود بھی وہ احیا کی حدیثوں کو تول کے دیکھ سکتے ہیں کہ وہ محدثانہ اصولوں پر پوری اترتی ہیں یا نہیں۔ اس کے بعد اگر امام صاحب کے ساتھ ان کے اندر حدیث کی حفاظت و صیانت کے لئے بھی کوئی حمیت ہوگی تو وہ بھی وہی کہیں گے جو مودودی صاحب نے کہا ہے۔ فن کے معاملے میں ذوق اور تکلفانہ احترام کوئی چیز نہیں ہے۔ ناقدین حدیث اس معاملے میں کسی کو بھی نہیں بخشتے۔

مہدی کی علامات سے متعلق جو روایتیں وارد ہیں ان کے درجے اور ان کی نوعیت سے متعلق اگر کوئی اور چیز میسر نہ آئے تو صاحبِ تحریر بزرگ ابنِ خلدون کے مقدمے ہی کی بعض

مودودی صاحب نے ان لوگوں کو شدی ہے جو پہلے ہی سے صحابہ و محدثین کی تحقیر کے درپے تھے۔

مودودی صاحب نے یہ ساری باتیں اپنے جی سے نہیں گھڑی ہیں بلکہ سیر و رجال اور دین کی معتبر کتابوں سے ہی لی ہیں۔ علامہ ابن عبدالبر نے اپنی کتاب العلم میں اس طرح کی بہت سی چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ محدثین ان معاملات میں اتنے نازک مزاج نہیں تھے جتنے ہمارے صاحب تحریر بزرگ ہیں، ورنہ جرح و تعدیل کا وہ فن وجود ہی میں نہ آتا جس پر مسلمان ناز کرتے ہیں۔

رہی یہ بات کہ مودودی صاحب نے ان باتوں کا ذکر کس لئے کیا ہے؟ صحابہ اور محدثین کی تضحیک کے لئے یا جرح و تعدیل کے صحیح نقطۂ اعتدال کو نمایاں کرنے کے لئے؟ تو اس کا اندازہ ہر شخص مضمون کا مطالعہ کرکے خود کر سکتا ہے۔ یہ حضرات سمجھتے ہیں کہ اگر مودودی صاحب اپنے مضمون میں ان باتوں کا ذکر نہ کرتے تو یہ ساری باتیں رازہی پڑی رہتیں۔ کوئی ان کا جاننے والا دنیا میں نہ تھا۔ حالانکہ صاحب تحریر بزرگ ممکن ہے ان باتوں سے بے خبر رہے ہوں، لیکن اس زمانے میں یہ ساری باتیں اکثر پڑھے لکھے لوگ جانتے ہیں اور منکرینِ حدیث انھی باتوں کو اچھال اچھال کر اُن کو یہ ثابت کرنے کے لئے استعمال کر رہے ہیں کہ پورے ذخیرۂ حدیث ہی کو دریا برد کر دینا چاہیے۔ ان حالات میں شتر مرغ کی طرح ریت میں منہ چھپانے کی پالیسی محض ایک احمقانہ پالیسی ہے۔ صحیح طریقہ اب صرف یہ ہے کہ اس طرح کی باتوں کے صحیح موقع و محل کو واضح کر دیا جائے اور ان سے نقدِ حدیث اور جرح و تعدیل کے سلسلے میں جو ٹھیک نتائج نکلتے ہیں، ان کو سامنے رکھ دیا جائے تاکہ اگر کوئی شخص ان باتوں پر سے گزرے تو کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔ علاوہ ازیں ہمیں اپنے بزرگ اسلاف کو معصوم فرشتے بنا کے بھی دکھلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ بشری کمزوریوں کو رکھتے ہوئے جتنے کچھ ہیں دنیا کے سامنے ان کو اسی شکل میں پیش ہونا چاہیے۔ ان کی یہ شکل بھی اتنی خوبصورت ہے کہ دنیا کو موہ لینے کے لئے کافی ہے۔ البتہ اگر ہم نے لوگوں کو انھیں بناوٹی شکل میں دیکھنے کا عادی بنا دیا تو اس سے اندیشہ ہے کہ جب کبھی تاریخ و سیر اور رجال کی کتابوں میں ان کے متعلق کچھ ناگوار باتیں لوگوں کی نگاہ سے

گزریں گی، بہت سے لوگوں کے ایمان تک متزلزل ہو جائیں گے۔ آخر حضرت عثمان اور حضرت علی کے زمانے کی تاریخ اور بعد کے فتنوں کے حالات آپ کہاں لے جاکر دفن کریں گے کہ کسی کی ان پر نظر نہ پڑنے پائے؟

مودودی صاحب سے صاحب تحریر بزرگ کو یہ بھی شکایت ہے کہ انہوں نے امام غزالی کو حدیث میں کمزور ٹھیرایا ہے اور امام مہدی کی علامات کے سلسلہ میں جو احادیث وارد ہیں ان کا انکار کیا ہے۔

میں صاحب تحریر بزرگ کو مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ ان دونوں جرموں میں سے کسی جرم میں بھی مودودی صاحب منفرد نہیں ہیں۔ ناقدینِ حدیث نے خود ہی ان دونوں جرموں میں پہل کرکے دوسروں کے لئے راہ کھول دی ہے۔ امام غزالی نے احیاء العلوم میں بکثرت کمزور حدیثیں نقل کی ہیں جن کی ناقدین حدیث نے نشان دہی کی ہے۔ اس کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں۔ یا تو امام صاحب نے عام صوفیہ کے طریقے پر پند و موعظت کے سلسلے کی حدیثوں میں محدثانہ چھان بین کو ضروری ہی نہ خیال کیا ہو، یا یہ بات ہو کہ فلسفہ و تصوف کی دلچسپیوں نے ان کو حدیث کی تحقیق و تنقید کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہ دیا ہو۔ بہرحال احیاء العلوم میں بکثرت کمزور حدیثیں موجود ہیں اور اس معاملے میں ذوق کا سوال پیدا نہیں ہوتا بلکہ نقدِ حدیث کے لگے بندھے اصول ہیں۔ اگر صاحب تحریر بزرگ ان اصولوں سے واقف ہیں تو خود بھی وہ احیا کی حدیثوں کو تول کے دیکھ سکتے ہیں کہ وہ محدثانہ اصولوں پر پوری اترتی ہیں یا نہیں۔ اس کے بعد اگر امام صاحب کے ساتھ ان کے اندر حدیث کی حفاظت و صیانت کے لئے بھی کوئی حمیت ہوگی تو وہ بھی وہی کہیں گے جو مودودی صاحب نے کہا ہے۔ فن کے معاملے میں ذوق اور تکلفانہ احترام کوئی چیز نہیں ہے۔ ناقدین حدیث اس معاملے میں کسی کو بھی نہیں بخشتے۔

مہدی کی علامات سے متعلق جو روایتیں وارد ہیں ان کے درجے اور ان کی نوعیت سے متعلق اگر کوئی اور چیز میسر نہ آئے تو صاحب تحریر بزرگ ابنِ خلدون کے مقدمے ہی کی بعض

بحثوں پر نگاہ ڈال ہیں۔ اس نے تمام روایات کی حیثیت کو واضح کر دیا ہے۔ علامات مہدی میں سے جن جن کو مودودی صاحب نے ناقابلِ اعتبار ٹھیرایا ہے ان میں سے ہر ایک کے ناقابلِ اعتبار ہونے کی دلیل بھی بیان کر دی ہے۔ آپ ان پر شور مچانے کے بجائے ان دلائل پر تنقید فرمائیں۔

(۶) چھٹا الزام یہ ہے کہ مولانا مودودی کو جماعت اسلامی کے لوگ مجدد سمجھنے لگے ہیں۔ غنیمت ہے کہ صاحبِ تحریر بزرگ نے صرف مجدد سمجھے جانے ہی کا الزام لگایا ہے۔ ورنہ الزام تو بعض حلقوں سے دعوائے مہدویت بلکہ نبوت تک کے لگائے جاچکے ہیں۔

اس معاملے میں لوگ عجیب افراط و تفریط میں مبتلا ہیں۔ اگر معاملہ اپنے حلقے کے کسی عالم یا شیخِ طریقت کا ہو تو اس کو بے تکلف مجدد شریعت و طریقت بناکے رکھ دیں گے، لیکن اگر معاملہ اپنے حلقۂ خاص سے باہر کے کسی شخص کا ہو تو اس کا کوئی قدردان چاہے کتنے ہی ہلکے الفاظ میں اس کی دینی خدمات کی تحسین کرے، ان حضرات کے دل پر اس کی سخت چوٹ پڑتی ہے اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسی گنجائشیں نکالنے لگتے ہیں کہ اس پر اور اس کے قدردانوں پر کوئی الزام چسپاں کیا جاسکے، تاکہ اور کچھ نہیں تو بدنام ہی کرکے دل ٹھنڈا کر لیا جائے۔ کہیں اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ یہ حضرات دین اور دینی معاملات کو اپنا اجارہ سمجھتے ہیں اور یہاں کسی اور کا چراغ جلتے دیکھنا ان کے لئے ناقابلِ برداشت ہے؟

تجدید اور مجدد کے معاملے میں میرا نقطۂ نگاہ اوروں کے نقطۂ نگاہ سے بالکل مختلف ہے۔

اس امت میں چونکہ کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، نبوت کا منصب آنحضرت صلعم پر ختم ہو چکا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس امت کے اندر شریعت کو قیامت تک کے لئے محفوظ کر دینے کے واسطے دو خاص انتظام فرمائے ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن مجید کو ہر قسم کی تحریفوں سے ہمیشہ کے لئے مامون کر دیا۔ اگلی امتوں کے صحیفوں میں جس طرح کی تحریفات واقع ہو گئیں اور جس کے سبب سے وہ نئے نبیوں کی بعثت کی محتاج ہوئیں وہ بات اس امت کو نہیں پیش آئے گی۔ دوسرا یہ کہ اس امت میں ایسا فساد کبھی نہیں واقع ہوگا کہ اس کے

اندر حق کی حامل کوئی جماعت سرے سے باقی ہی نہ رہ جائے۔ اس حقیقت کی طرف قرآن مجید میں اشارات موجود ہیں اور آنحضرت صلعم نے بھی نہایت واضح الفاظ میں اس کا ذکر فرمایا ہے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ اسلام غربت (اجنبیت اور بیکسی) کی حالت میں شروع ہوا اور پھر اسی حالت اس پر لوٹ آئے گی، مبارک ہیں وہ جو اجنبی سمجھے جائیں کیونکہ وہ لوگوں کی پیدا کی ہوئی خرابیوں کی اصلاح کریں گے۔ ایک دوسری روایت میں یہ مضمون ہے کہ میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا اور حق کے مخالفین اس کو اقامتِ حق کے کام سے روک نہ سکیں گے (او کما قال)۔ اسی طرح ایک اور روایت میں ہے کہ جب اس امت میں اس طرح فساد سرایت کر جائے گا جس طرح اس شخص کے جسم میں زہر سرایت کر جاتا ہے جس کو باؤلے کتے نے کاٹ کھایا ہو تب بھی اللہ تعالیٰ اس امت کے ایک عضو کو فساد سے محفوظ رکھے گا۔

یہ تمام حدیثیں اس بات پر شاہد ہیں کہ اس امت کے اندر صالحین و مصلحین اور دین حق پر قائم رہنے والوں اور لوگوں کے پیدا کیے ہوئے بگاڑ کی اصلاح کرنے والوں کا ایک گروہ ہمیشہ موجود رہے گا۔ مجددین اور مصلحین کا یہی گروہ ہے جس کا ذکر "من یجدد لھا دینھا" والی حدیث میں آیا ہے لیکن چونکہ اس حدیث میں "مائۃ" کا لفظ آیا ہے جو دور اور صدی دونوں معنوں کے لئے آتا ہے نیز "من" کا لفظ آیا ہے جو واحد اور جمع دونوں کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے اس لئے عموماً لوگوں کو اس کا مطلب سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی۔ اکثر لوگوں نے "مائۃ" کو صدی کے معنی میں اور "من" کو واحد کے مفہوم میں لیا اور یہ سمجھے کہ ہر صدی میں اللہ تعالیٰ کسی خاص شخص کو بھیجا کرے جو اس صدی کا مجدد ہوا کرتا ہے حالانکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہر دور میں اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو اٹھاتا رہتا ہے جو اس دور میں خدا کے دین کو تازہ کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ بعینہ اسی مضمون کا دوسرے الفاظ میں اعادہ ہے جو اوپر کی حدیثوں میں گزر چکا ہے۔ نہ اس سے کچھ مختلف ہے اور نہ اس مضمون پر ایک حرف کا اضافہ ہے۔ لیکن لوگ "مائۃ" اور "من" دو لفظوں کا صحیح مفہوم سمجھنے میں غلطی کر جانے کی وجہ سے خواہ مخواہ کے تکلفات میں پڑ گئے۔ قطع نظر اس کے کہ

اس غلط مطلب نے بہت سے کمزور نفوس کے اندر وسوسہ اندازی کی اور وہ مجددیت کے خواب دیکھنے لگے، اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ لوگوں نے ہر صدی کے آغاز و اختتام پر ایک مجدد کی تلاش شروع کردی۔ اور اگر کوئی اہل آدمی نہ مل سکا تو اس حدیث کو صحیح ثابت کرنے کے لئے کسی نا اہل ہی کو اس مسند پر لا بٹھایا کہ بہرحال جگہ خالی نہیں رہنی چاہیے۔[1]

میرے نزدیک مجدد والی حدیث کا مفہوم وہی ہے جو دوسری حدیثوں میں بیان ہوا ہے یعنی اللہ تعالیٰ ہر دور میں مصلحین و مجددین کی ایک جماعت کو برپا رکھے گا جو اللہ کے دین پر خود بھی قائم رہے گی اور دوسروں کو بھی قائم رکھنے کی کوشش کرتی رہے گی۔ اس جماعت کی خاص پہچان یہ ہوگی کہ رسول اور صحابہ کے طریق پر گامزن رہے گی اور اقلیت میں ہونے کے باوجود باطل سے کشمکش کرتی رہے گی۔

جہاں تک اس مسئلے کی اصولی حیثیت کا تعلق ہے اس کے بارے میں میرا نقطۂ نگاہ یہ ہے۔ باقی رہا خاص مودودی صاحب کا معاملہ تو میں اُن کو اس سے اونچا سمجھتا ہوں کہ وہ اس قسم کے کسی وسوسے میں مبتلا ہوں۔ وہ ایک دانشمند اور خدا ترس آدمی ہیں اور راہِ حق کی آزمائشوں اور صعوبتوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ مجھے امید نہیں ہے کہ وہ خدا کے ہاں پہنچنے

[1] بعینہٖ یہی بات مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی ہے۔ ان سے پوچھا گیا: ہر صدی میں مجدد کا مبعوث ہونا ثابت ہے، اس صدی کا مجدد کون ہے؟ جواب میں فرمایا: "ہر وقت میں جو علماء قامع بدعت اور محی سنت ہوں اُن کا مجموعہ مراد ہے۔ جو شخص بایں طرح ہو اُس مجموعے کا ایک جزء خیال کرنا چاہیے۔ اور جن لوگوں نے ایک کو قرار دیا ہے اُن کو سخت مصیبت پیش آئی۔ ہر چند تاویلات کی گئیں تاہم درست نہیں ہوا" (فتاویٰ رشیدیہ حصہ دوم۔ ص ۵۲)

سے پہلے ہی اپنے مرتبے اور درجے کا فیصلہ کرنے کی جسارت کریں گے[1]۔ جماعت کے اندر اگر کچھ لوگ ایسے ہیں جو ان کو مجدد خیال کرتے ہیں تو میں ان کو بھی یہ مشورہ دوں گا کہ وہ اس فیصلے میں جلدی نہ کریں۔ جب تک ایک شخص زندہ ہے وہ فتنوں سے مامون نہیں ہو سکتا کیا خبر جس شخص کو آپ آج اس صدی کا مجدد ثابت کرتے ہیں کل کو وہ کس کیمپ میں ہو اور آپ کس کیمپ میں ہوں۔ پھر جو باتیں خدا کے فیصلہ کرنے کی ہیں آپ ان کا فیصلہ کرنے والے کون؟ کسی شخص کے مجدد ہونے کے لئے تنہا یہی بات تو کافی نہیں ہے کہ اُس نے آپ کے نقطۂ نظر سے تجدید و اصلاح کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کا خلوص اور اس کی نیک نیتی بھی تو مطلوب ہے جس کا فیصلہ بہرحال ہم اور آپ نہیں کر سکتے بلکہ خدائے علام الغیوب ہی کر سکتا ہے۔

(۷) آخری الزام جو صاحبِ تحریر بزرگ نے مولانا مودودی اور اُن کے رفقاء پر لگایا ہے وہ فوٹو کھنچوانے کا ہے۔ یہ الزام بالکل ہی بے بنیاد ہے۔ جیل سے رہائی کے بعد مولانا

---

[1] اُن کا اپنا بیان اس سلسلے میں یہ ہے جو اب سے کئی سال پہلے "ترجمان القرآن" میں شائع ہو چکا ہے :

"اس قسم کے شبہات کا اظہار کرنا کسی ایسے آدمی کا کام تو نہیں ہو سکتا جو خدا سے ڈرتا ہو، جسے خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کا احساس ہو، اور جس کو اللہ تعالیٰ کی یہ ہدایت بھی یاد ہو کہ اجتنبوا کثیرا من الظن ان بعض الظن اثم۔ جو حضرات اس قسم کے شبہات کا اظہار کر کے بندگانِ خدا کو جماعت اسلامی کی دعوتِ حق سے روکنے کی کوشش فرما رہے ہیں، میں نے ان کو ایک ایسی خطرناک سزا دینے کا فیصلہ کر لیا ہے جس سے وہ کسی طرح رہائی حاصل نہ کر سکیں گے، اور وہ سزا یہ ہے کہ انشاء اللہ میں ہر قسم کے دعووں سے اپنا دامن بچائے ہوئے اپنے خدا کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا اور پھر دیکھوں گا کہ یہ حضرات خدا کے سامنے اپنے ان شبہات کی، اور ان کو بیان کر کر کے لوگوں کو حق سے روکنے کی کیا صفائی پیش کرتے ہیں۔"

(ترجمان القرآن۔ بابت ماہ رجب ۱۳۶۵ھ، مطابق ماہ جون ۱۹۴۶ء)

مودودی کے ایک دو فوٹو بعض اخباروں میں ضرور چھپے ہیں لیکن ان کے کھینچے جانے یا ان کے شائع ہونے میں مولانا کی مرضی یا ان کے علم کو کوئی دخل نہیں ہے۔ کھینچنے والوں نے کھینچا اور چھاپنے والوں نے چھاپا۔ اس کے عذاب و ثواب کے ذمہ دار وہ خود ہیں۔ مولانا مودودی اخلاقی اعتبار سے اتنے بودے نہیں ہیں کہ ایک طرف تو تصویر کھنچوانے اور اس کے شائع کرانے کی حرمت کا فتویٰ دیں دوسری طرف اپنے ساتھیوں کو لے کر فوٹو کھنچوانے کھڑے ہو جائیں۔ صاحبِ تحریر بزرگ سے گزارش ہے کہ وہ اپنے حلقے کے لوگوں کے بارے میں حسنِ حُسنِ ظن سے کام لینے کے عادی ہیں۔ اگر اس کے دسویں حصہ حُسنِ ظن سے بھی اس معاملے میں کام لیتے تو ایک مسلمان کے متعلق وہ اس بدگمانی میں نہ مبتلا ہوتے لیکن یہ عجیب دردانگیز صورتِ حال ہے کہ جہاں معاملہ اپنے حلقے سے باہر والوں کا ہوتا ہے وہاں تو یہ حضرات مچھر کو بھی چھاننے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اگر معاملہ اپنوں کا ہو تو اونٹ تک نگل جائیں گے۔[1]

جواب تتمہ

صاحبِ تحریر بزرگ نے اپنے مضمون کے اُس ٹکڑے کو "ردحِ مضمون" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے ہمارے نزدیک بھی اس ٹکڑے کی حیثیت فی الواقع یہی ہے۔ ان کے طول طویل مضمون سے بھی ان کا باطن اتنی خوبی کے ساتھ ہمارے سامنے بے نقاب نہیں ہو سکا تھا جتنی خوبی کے ساتھ ان کی ان چند سطروں میں وہ بے نقاب ہو گیا ہے۔ وہ ان سطروں میں اپنا باطن ہی بے نقاب کرنے پر مجبور نہیں ہو گئے ہیں بلکہ انھوں نے ہماری دعوت کا وہ باب بھی ہماری آنکھوں کے سامنے کھول دیا ہے جو اتنے نمایاں طور پر ہمارے سامنے یا تو آیا ہی نہیں تھا یا آیا تھا تو ہم نے اس کو اچھی طرح پڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

مولانا صاحب نے اپنے مخصوص عالمانہ اندازِ بیان میں جو کچھ فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو لوگ مقبولِ خدا ہوتے ہیں ان کی مقبولیت کا آغاز خواص سے ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ

[1] مولانا عبیداللہ سندھی کی مثال آخر کس سے چھپی ہوئی ہے۔

وہ پہلے عوام کالانعام میں مقبول ہوں اور اس کے بعد خواص ان کی طرف متوجہ ہوں۔ اس اصول کو قائم کرنے کے بعد وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ مودودی صاحب کوئی مقبولِ خدا آدمی ہرگز نہیں ہو سکتے اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اقامتِ دین کے نام سے جو دعوت شروع کر رکھی ہے اس میں صرف ان لوگوں نے ان کا ساتھ دیا ہے "جو کل تک یا رائے سے کورے تھے یا یقین و خیر سے کورے، علم و فکر سے عاری تھے یا تقویٰ و تورع سے فارغ، ختمِ نبوت میں مذبذب تھے یا خاکسار یت کے علمبردار، نیچریت سے مسموم تھے یا الحاد کے شکار۔ وہی متوجہ ہو رہے ہیں۔ اہلِ علم و تقویٰ گویا روشناس ہی نہیں۔ یا مدارسِ عربیہ کے چند نئے نئے فارغ شدہ جو زمانۂ تحصیل میں بھی بجائے عبدو (تقویٰ) اور کمیونزم بکتے[1] تھے۔"

مولانا صاحب کی یہ سطریں پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو کس طرح دہراتی ہے اور دعوتِ دین کا ہر دور ایک دوسرے سے کس قدر مشابہ واقع ہوا ہے!

جو طعنے آج مولانا صاحب جماعت اسلامی کے خادموں کو سنا رہے ہیں بعینہٖ یہی طعنے کم و بیش انہی الفاظ میں اُن لوگوں کو سنائے گئے تھے جنھوں نے اگلے زمانوں میں نبیوں اور رسولوں کا ساتھ دیا تھا۔ اور یہ طعنے دینے والے اپنی نسبت بعینہٖ وہی رائے بھی رکھتے تھے جو مولانا صاحب اپنی نسبت اور اپنے زمرے کے دوسرے بزرگوں کی نسبت رکھتے ہیں۔ حضرت نوحؑ، حضرت صالحؑ اور حضرت شعیب علیہم السلام کے زمانوں میں جن لوگوں نے دعوتِ حق کا ساتھ دیا ان کو ان کے زمانے کے "اکابر" کی زبان سے یہ طعنہ سننا پڑا کہ یہ "اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ" ہیں یعنی حقیر اور "رائے سے کورے ہیں"۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے جب دعوتِ حق بلند کی تو وہ تمام علمائے یہود جو "علم و عمل، فکر و اخلاص، تجربہ و تدین، رائے اور یقین کے اعتبار سے عظیم القدر" ہونے کے مدعی تھے "وہ بالکل غیر متوجہ رہے" اور جن چند غریبوں نے ان کا ساتھ دیا ان کو ان "اہلِ علم و تقویٰ" حضرات نے سُفہا یعنی جاہل اور علم و فکر سے عاری قرار دیا اس لئے کہ وہ غریب مشیخت کی گدیوں اور درس و افتا کی مسندوں سے ناآشنا، دریا کے کنارے کے ماہی گیر تھے۔ اسی طرح ان غریبوں کو

[1] ہمیں نہیں معلوم کہ جماعت میں شامل ہونے والے کون کون دیوبندی حضرات کا یہ حال رہا ہے۔

تقویٰ اور تورع سے فارغ" بھی قرار دیا گیا اس لیے کہ علما حضرات کو ان سے یہ شکایت تھی کہ یہ کبھی کبھی ہاتھ دھوئے بغیر ہی کھانا کھا لیتے ہیں۔ انھی بزرگوں کے جواب میں حضرت مسیح علیہ السلام نے یہ فرمایا تھا کہ "کتنے ہیں جو آگے تھے وہ پیچھے ہو جائیں گے اور کتنے ہیں جو پیچھے تھے وہ آگے ہو جائیں گے"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دعوتِ حق بلند کی تو مکہ اور طائف کے تمام اکابر جو صاحب الرائے سمجھے جاتے تھے اور قریش کے تمام صنادید جو بیت اللہ کی مختلف گدیاں سنبھالے ہوئے تھے بالکل "غیر متوجہ رہے" اور صاف الفاظ میں انھوں نے کہا کہ کچھ سر پھرے چھوکروں اور کچھ غلاموں نے یہ سارا ہنگامہ اٹھا رکھا ہے، بزرگوں میں سے کوئی اس فتنے میں شریک نہیں ہے۔ یہود کے علما نے بھی آگے بڑھ کر انھی لوگوں کی تائید کی اور کہا کہ یہ کچھ سفہا یعنی "فکر و رائے سے عاری" لوگ ہیں جو محمد کا ساتھ دے رہے ہیں۔

اگرچہ ہمارے حقیر کام کو انبیا علیہم السلام کے عظیم کام سے وہی نسبت ہے جو ذرے کو آفتاب سے ہوتی ہے، اور ہماری شخصیتوں کا تو ان سے کوئی مقابلہ ہی نہیں، لیکن دونوں کے مخالفین کے لب ولہجے کی اس یکسانی اور ان کی ذہنیت کی اس مشابہت کو دیکھ کر کبھی کبھی دل میں یہ خیال گزرتا ہے کہ ع گرچہ خوردیم نسبتیست بزرگ۔

اصل یہ ہے کہ آدمی جب تک حق کو اللہ کی کتاب اور اس کے رسولوں کے طریقے سے پہچاننے کے بجائے اشخاص و افراد کے ذریعے سے پہچاننے کی کوشش کرے گا اس پر حق کی راہ کبھی کھل ہی نہیں سکتی۔ اس ذہنیت کے لوگ اپنے آگے چلنے والوں کے پیچھے چلتے ہیں اور اپنی سادہ لوحی سے یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح وہ کسی کے پیچھے آنکھ بند کر کے لگ گئے ہیں اسی طرح حق بھی دست بستہ ان کے پیچھے پیچھے لگ گیا ہے اور ممکن نہیں ہے کہ ان کی پیروی کے سوا حق کو پانے کا کوئی اور ذریعہ مل سکے۔ اسی ذہنیت کے لوگوں نے مسیحؑ کے زمانے میں علمائے یہود کا ساتھ دیا اس لیے کہ بہرحال "خواص" کی حیثیت یروشلم کے ان پشتینی دینداروں ہی کو حاصل تھی نہ کہ دریا کے کنارے کے ان ماہی گیروں کو جنھوں نے مسیح علیہ السلام کا ساتھ دیا تھا۔ اسی طرح اس زمرے کے لوگوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مکہ اور طائف

کے اکابر کو ساتھ دیا اور مسلمانوں کے مقابلے میں ان کو زیادہ راست رو (اھدیٰ) قرار دیا اس لئے کہ وقت کے خواص اور اصحاب رائے وہی تھے نہ کہ صہیب و سلمان جو وقت کے اکابر کی نگاہوں میں اراذلنا بادی الرائے کی حیثیت رکھتے تھے۔ ہم اس ذہنیت کے لوگوں سے ہمیشہ مایوس رہے ہیں۔ ہم نے اپنی دعوت میں کبھی ان کو پیش نظر نہیں رکھا۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ لوگ واضح سے واضح حق کو بھی قبول نہیں کر سکتے اگر وہ ان کے پاس ان کے اکابر کے واسطے سے نہ آئے! اور غلط سے غلط بات کو بھی اختیار کر لیں گے اگر ان کے اکابر اس کی علمبرداری یا کم از کم تصدیق کر دیں گے اس لئے ہم نے اپنا تخاطب براہ راست اُنھی سے رکھا ہے جو موجودہ سوسائٹی کی قیادت فرما رہے ہیں۔ عام اس سے کہ ان کا تعلق علماء کے طبقے سے ہو یا اہل سیاست کے طبقے سے۔

مولانا صاحب نے حدیث کا یہ مطلب تو بالکل ٹھیک سمجھا ہے کہ کسی دعوتِ حق کو سب سے پہلے آگے بڑھ کر قبول کرنے والے ہمیشہ "خواص" ہی ہوتے ہیں لیکن ان خواص کی پہچان کیا ہے؟ کیا یہ کہ وہ کسی دینداری کی موروثی گدیوں کے وارث ہوتے ہیں؟ کیا یہ کہ وہ درس و افتا کی مسندوں پر سرفراز ہوتے ہیں؟ کیا یہ کہ وہ لمبی لمبی عبائیں پہنتے ہیں اور ربی اور عالم کہلانا پسند کرتے ہیں؟ کیا یہ کہ جب وہ بازاروں میں نکلتے ہیں تو لوگ ان کے ہاتھ پاؤں چومتے ہیں؟ یقیناً مولانا تسلیم کریں گے کہ ان باتوں میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جس کو کسی شخص کے "خواص" میں سے ہونے کی دلیل قرار دیا جا سکے۔ پھر غور کرنا چاہیے کہ خواص کی پہچان ہے کیا؟ حق کے قبول کرنے والے خواص کے اوصاف جہاں تک قرآن و حدیث سے میں سمجھ سکا ہوں، میں نے اپنی کتاب "دعوتِ دین اور اس کا طریقِ کار" میں تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا اس کتاب کا وہ باب ضرور ملاحظہ فرمائیں جو دعوتِ حق کے موافقین اور مخالفین سے متعلق ہے تاکہ وہ اچھی طرح سمجھ سکیں کہ ان خواص کی کیا شناخت ہے جو کسی دعوتِ حق کو قبول کیا کرتے ہیں۔

یہاں تفصیل کی گنجائش تو نہیں ہے لیکن میں حق کو قبول کرنے والے خواص کے چند اوصاف کا اجمالاً ذکر کروں گا جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں۔

—— ان کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے گروہی تعصبات اور آبائی تقلیدات سے بالکل آزاد ہوتے ہیں۔

—— اُن کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ اندھی تقلید کی بیماری سے پاک ہوتے ہیں۔ دوسروں کے پیچھے

چلتے ہوئے خود اپنی آنکھیں بھی کھلی رکھتے ہیں۔

——— وہ حق کی کسوٹی صرف اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کو مانتے ہیں۔ اشخاص کو حق و باطل کا معیار نہیں بناتے۔

——— اخلاقی اعتبار سے اپنی سوسائٹی میں نمایاں ہوتے ہیں۔ پست ہمت، ضمیر فروش اور خود غرض نہیں ہوتے اور نہ باطل کا مقابلہ کرنے میں بزدل ہوتے ہیں۔

——— وقت کے نظام باطل سے ان کی وابستگی اگر ہوتی بھی ہے تو خود غرضانہ نہیں ہوتی۔

——— وہ غرور اور گھمنڈ میں مبتلا نہیں ہوتے کہ اپنی ذات اور اپنے حلقے سے باہر کسی خیر کا تصور کر سکیں اور نہ کسی کی رہنمائی قبول کر سکیں۔

یہ علامات ہیں جو قرآن مجید میں ان لوگوں کی بیان کی گئی ہیں جو حق کو قبول کیا کرتے ہیں اور جن کو قرآن حق کے "خواص" میں سے شمار کرتا ہے۔ مولانا صاحب اگر ان کسوٹیوں پر جماعت اسلامی کے ارکان کو جانچیں گے تو مجھے امید ہے کہ وہ ان کو ان شاء اللہ موجودہ سوسائٹی کا مکھن ہی پائیں گے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ان کے اندر برگزیدہ اور مرشیتہ کے افراد شامل ہیں۔ ان میں وہ بھی ہیں جو انگریزی درس گاہوں کی فضا کے ہولوں سے بچ کے آئے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو عربی مدرسوں کے قبرستانوں سے نکل کے آئے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو وقت کی مختلف تحریکوں سے متاثر رہے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو مذہبی گروہ بندیوں اور حلقوں سے کسی نہ کسی نوعیت سے وابستہ رہے ہیں ——— ہر طرح کے لوگ اس جماعت میں آ کے شامل ہوئے ہیں لیکن ان میں سے ہر شخص اپنے اندر وہ خوبیاں ضرور رکھتا ہے جو اوپر بیان ہوئی ہیں اور یہی خوبیاں تھیں جو اس کو اس دعوت کی طرف کھینچ کے لائیں جو اقامت دین کے لیے اس کے سامنے بلند کی گئی۔ آپ حضرات اگر ان کو سُنہا اور راز دلنا بازی انڈے کہتے ہیں تو شوق سے کہیں، ہم اس کے جواب میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اور آپ کو، دونوں کو حق پر چلنے والا بنائے اور کبر و غرور کی آفتوں سے محفوظ رکھے۔